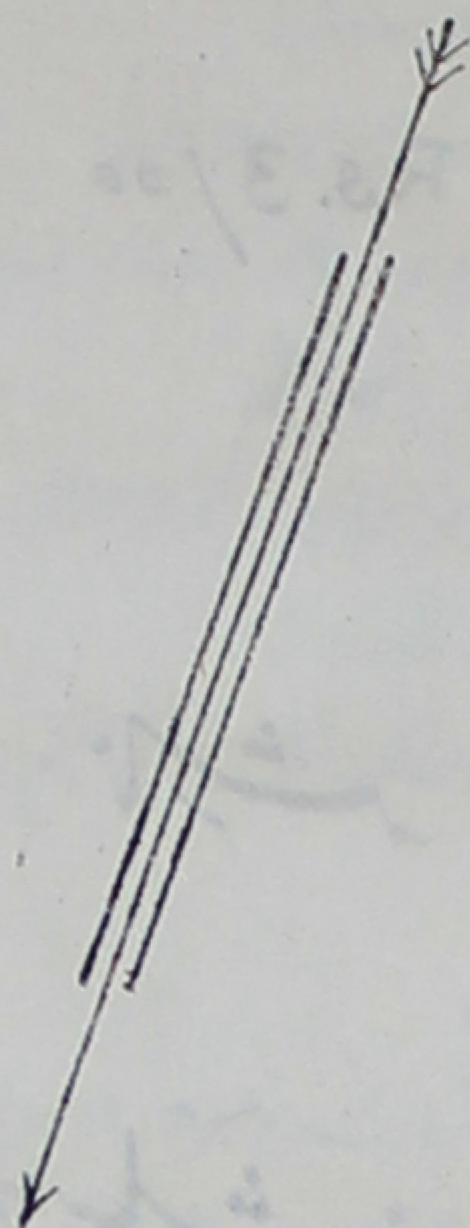
طنزیاتِ آزاد

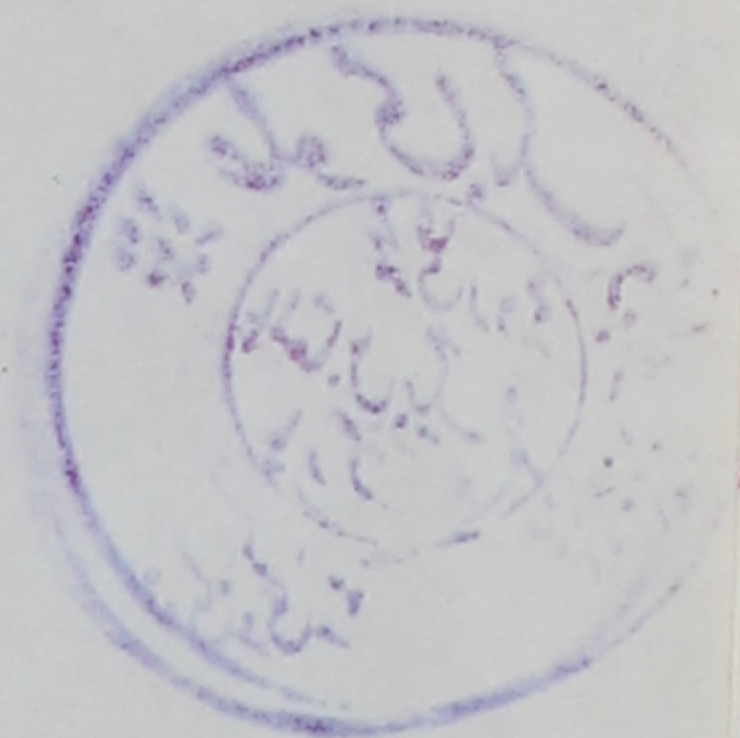




مولانا ابوالکلام آزاد

قیمت تین روپے

Rs. 3/00



ناشر

تاج پبلشرز دھلی

فہرست



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابتدائیہ

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے ۱۹۱۵ء میں البلاغ کے دور میں فرمایا تھا کہ :-

"اگر پیام اجل سر پر آپہنچا تو آہ کس سے کہئے اور کون جانتا ہے کہ اس مشت خاک کے ساتھ کیا کیا چیزیں ہیں جو سپرد خاک ہونگی اور فیضان الٰہی نے اپنے فضل مخصوص سے کیسے کیسے دروازے علوم و معارف کے اسی عاجز پر کھولے ہیں جو بغیر اس کے کہ ایک طالب صادق و صالح بھی اُن سے گذرے بند کے بند رہ جائیں"

حضرت مولانا مرحوم کی وفات کی وجہ سے دنیائے اسلام نے نہ صرف ایک مفسر قرآن اور جامع کمالات شخصیت کھودی ہے بلکہ اردو ادب ایک بڑے مفکر و صاحبِ فن طنز و مزاح نگار سے محروم ہوگیا ہے۔ جناب غلام احمد فرقت کاکوروی رقم طراز ہیں کہ :-

"بہت سے لوگ جو بظاہر بے حد سنجیدہ، مذہبی، خاموش اور اپنے آپ کو بہت ہی لئے دئے نظر آتے ہیں۔ ان میں بعض بعض اپنی نجی زندگی میں بے حد شوخ اور بذلہ سنج ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی خلوت و جلوت میں بڑا بعد ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار بھی انہیں بزرگوں میں سے تھا۔ جو بظاہر خاموش اور بہ باطن ایک بلاغ و بہلذ سنج کے انسان تھے۔ چنانچہ جن لوگوں سے مولانا کی بے تکلفی تھی ان کا کہنا ہے

کہ وہ اپنی نجی زندگی میں نہ صرف بے حد شوخ، ہنس مکھ اور بذلہ سنج ہی تھے بلکہ ضلع جگت اور رعایت لفظی یا فقرے چست کرنے میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ ان کی فقرے بازی کا اندازہ ان کی مندرجہ ذیل رائے سے ہوتا ہے جو انھوں نے ایک مرتبہ مولانا ظفر علی خاں اور مولانا شوکت علی مرحوم کے بارے میں قائم کی تھی۔

"ملک میں کسی تحریک کو مہینوں کی بجائے ہفتوں میں چلانا ہو تو مولانا ظفر علی خاں اور شوکت علی کو چھوڑ دو۔ وہ بہ سرعت یہ قلعہ بنا ڈالیں گے۔ لیکن جب یہ قلعہ بن جائے تو ان کو فوراً باہر کر دو کیونکہ وہ پھر اسی قلعہ کو ڈھا دیں گے۔"

مندرجہ بالا رائے کی تصدیق حضرت مولانا مرحوم کے ان طنزیہ مضامین سے ہوتی ہے جو بیشتر انھوں نے دور الہلال و البلاغ میں سپرد قلم گئے اور ہم ان بکھرے ہوئے بیش بہا مضامین کو کتابی صورت میں پیش کرنے کا فخر حاصل کر رہے ہیں۔

اس مجموعے کا نام حدیث الغاشیہ ہم الہلال سے مستعار لے رہے ہیں جس عنوان کے تحت اس قسم کے مضامین الہلال کے دور میں پہلے پہل حضرت مولانا کے معجز نگار قلم سے شائع ہوئے۔

اس مجموعے کا مقصد وحید یہ ہے کہ مولانا مرحوم کے جواہر پاروں کو جو ایک زمانہ سے مولانا کے شیدائیوں کی نظروں سے اوجھل تھے۔ یکجا کر کے محفوظ کیا جائے۔ کیونکہ مولانا مرحوم کی موت کی وجہ سے علوم و معارف کے جو دروازے حضرت مولانا کی ذات سے وابستہ تھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند ہو گئے ہیں۔

امید ہے اردو ادب کے پرستار ہماری اس حقیر کوشش کو بہ نظر استحسان دیکھیں گے۔ نظیری کی زبان میں ہم آخر میں حضرت مولانا مرحوم کی یاد پھر تازہ

کرتے ہیں۔

جوہر بینش من در تہ زنگار مباد
آنکہ آئینہ من ساخت ز پرداخت دریغ
تو شیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

نذیر احمد

مسلم لیگ (اجلاس ۱۹۱۶ء)

(البلاغ ۴ر فروری ۱۹۱۶ء)

مسلم لیگ کے گذشتہ اجلاس کا تذکرہ اخبارات و رسائل کے صفحات اور بحث و مذاکرہ کی صحبتوں میں قریب الاختتام ہے۔ کامل چار ہفتے اوپر گذر چکے اور ہر شاہد و سامع نے اس کے نقد و بحث میں کچھ نہ کچھ حصہ لیا۔ تاہم بہت سی ضروری باتیں اب تک باقی ہیں اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اصلیت کو مشتبہ کرنے کے لئے چند مفسدانہ غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی ہیں۔

جنوری کے اوائل میں اگر ہمیں فرصت ملتی تو بہ تفصیل اس واقعہ کی نسبت لکھتے لیکن اب تفصیل کا موقعہ نہیں رہا۔ صرف ان غلط فہمیوں کی طرف اشارہ کر دینا چاہتے ہیں جن کا اثر واقعہ کی عارضی حیثیت کی جگہ اصول نتائج و عبر پر ہوتا ہے۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز جو سامنے آتی ہے وہ مسلمانان بمبئی کے اندرونی اختلافات کا مسئلہ ہے۔ جس کو عام طور پر لیگ کے ہنگامہ کی اصل علت قرار دیا جاتا ہے۔

ہم اس تعجب اور حیرانی کے ظاہر کرنے کے لئے الفاظ نہیں پاتے جن کے ساتھ ہم نے ان تحریروں کو پڑھا ہے جو بعض مدعیانِ علم و واقفیت نے شائع کی ہیں۔ اور جن کے اندر وہ یقین کے ساتھ ظاہر کرتے ہیں کہ مسلمانان بمبئی کے سیاسی اختلاف اور پارٹی فیلنگ نے لیگ کے جلسے کو اس مصیبت سے دوچار کیا۔

دنیا میں علم ویقین کے حاصل کرنے کا ذریعہ مشاہدہ ہے۔ سماع ہے۔ روایت ہے۔ قیاس صحیح ہے اور تواتر و تسلسل واقعات ہے۔ ہم حیران ہیں کہ لیگ کے اجلاس بمبئی کے متعلق یہ تمام ذرائع موجود ہیں اور ان میں سے ہر ذریعہ صاف صاف یقین دلا رہا ہے کہ اس ہنگامہ کو نہ تو مسلمانان بمبئی کے کسی سیاسی اختلاف آراء سے تعلق تھا اور نہ مختلف سیاسی جماعتوں کی کشمکش سے۔ یہ جو کچھ ہوا اس کی علت اصل صرف ایک ہی تھی۔ اور وہ صرف اس مخفی طاقت کی کارفرمائی تھی جو ہمیشہ خود تو پس پردہ رہتی ہے لیکن اپنے تنخواہ دار سپاہیوں کو آگے بھیج دیتی ہے تاکہ میدان رزم میں خیمہ نشین سپہ سالار کے احکام کی تعمیل کریں۔

لیگ کے اجلاس سے پہلے جو کچھ ہوا، اور لیگ کے اجلاس کے اندر جو کچھ ہوا۔ دونوں کی پوری سرگزشت دنیا کے سامنے موجود ہے۔ اور وہ اس حقیقت کو اس درجہ روشن اور واضح صورت میں نمایاں کر رہی ہے کہ ہندوستان کے مخفی دسائس و فریب کی پوری تاریخ میں ایسا بے نقاب جلوہ کبھی بھی نظر نہیں آیا تھا۔

ان نادانوں یا دانستہ حق پوشوں کا بیان ہے کہ لیگ نے اس سال کانگرس سے ملنا چاہا۔ اور ہندوستان کے مستقبل کی امیدوں میں وہ یک قلم ہندوؤں کے ہمدوش کھڑی ہوگئی۔ مثل اور مقامات کے بمبئی میں بھی مسلمانوں کا ایک گروہ اس بدعت کا مخالف موجود تھا۔ اس نے پہلے کوشش کی کہ جلسہ نہ ہو۔ پھر جب سید علی امام نے بمبئی میں راضی نامہ کرانے کی یادگار عزت حاصل کی تو مجبوراً ساتھ ہو گیا۔ تاہم اختلاف بدستور تھا۔ اس کی دانشمندی و سیاست فہمی کسی طرح بھی گوارہ نہیں کر سکتی تھی کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر اپنے آپ کو تباہ کر ڈالیں۔ پس وہ ایک مجاہد حق جماعت کی طرح جہاد فی سبیل الحق کے لیے تیار ہو گیا۔ اور شہر کے بدمعاشوں اور اراذل کی ایک پلٹن طیار کر کے لیگ پر حملہ کر دیا۔

لیکن جن لوگوں کو اخبارات کے صفحوں پر اس طرح علانیہ کذب سرائی سے عار نہیں آتا، کیا وہ بتلا سکتے ہیں کہ جس جماعت نے لیگ کی مخالفت میں حصہ لیا، ان میں وہ کون لوگ ہیں جن کو سیاست فہمی اور قوم پرستی کا یہ خلعت عطا ہو رہا ہے۔؟ کیا پچاس ساٹھ آدمیوں کی وہ جماعت جو وزیٹروں کے حلقہ میں آکر بیٹھ گئی تھی اور جسے صرف یہ تعلیم دی گئی تھی کہ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد "شیم شیم" کا نعرہ بلند کرتے رہنا، چنانچہ وہ مسکین اپنے پیشواؤں کے شور و غل پر بھی اس آموختہ کو دہرا دیتے تھے۔ اگر وہ نہیں تو پھر کیا علی خاں معروف بہ عبدالرؤف جو پرانی گاڑیوں کو رنگا کرتا ہے اور جس غریب کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کانگرس کیا بلا ہے اور لیگ کس جانور کا نام ہے؟ اگر وہ بھی نہیں تو پھر کیا بمبئی کے بدمعاشوں کا وہ سردار جو اسٹیج کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا اور جو لیگ سے اپنے سیاسی اختلاف کو اس ماہرانہ جملے میں ادا کرتا تھا کہ "میرا ملک کابل کیوں ہندوؤں کو بخش رہے ہو!" اگر یہ لوگ صرف مزدور تھے اور سیاست کا معلم وہی تھا جس کے ذریعے انھوں نے مزدوری پائی تو پھر کیا سلیمان قاسم کے روپیوں کی تھیلیوں میں اس سیاسی جنم داتا کو ڈھونڈیں۔ حالانکہ روپیہ سے آلو اور بمبئی کے بدمعاش دونوں چیزیں خریدی جا سکتی ہیں۔ مگر نہ تو عقل خریدی جا سکتی ہے اور نہ علم!

لطف یہ ہے کہ ان بحث کرنے والوں میں اکثر لوگ وہ ہیں جو خود بمبئی میں موجود تھے، لیکن ان کی واقفیت کا یہ حال ہے کہ بیچارے علی خاں سندھی کو "مولانا عبدالرؤف" کے لقب سے لکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ کوئی بمبئی کا بڑا لیڈر ہے جس نے بھرے جلسے میں مخالفت کی اور محض سیاسی اختلاف کی وجہ سے شور و غل مچایا۔ حالانکہ بمبئی کا ہر شخص اس شخص کے حالات سے واقف ہے اور ہر جگہ اس قسم کے باجے بازاروں میں بکثرت ملتے ہیں جن کو کوک دیا جائے تو بجتے رہیں گے۔

بہر حال بمبئی میں لیگ کے موقع پر جو کچھ ہوا اس کو کسی سیاسی اختلاف و جماعت بندی سے کوئی تعلق نہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہندوستان کا اتحاد ان لوگوں کی نظروں میں کس درجہ مہیب چیز ہے جنہوں نے اپنی کامیابیوں کا محل تفریق عناصر کی بنیاد پر تعمیر کیا ہے۔ علی الخصوص موجودہ حالات میں کانگریس اور لیگ کا یکجا ہونا اور مل جل کر ایک کمیٹی بنانا ان کے مقاصد کے لئے کس درجہ ہولناک ہے؟ بمبئی میں انہی مقاصد سے لیگ کو منعقد کیا جاتا تھا۔ پس کوشش کی گئی کہ اس راہ میں موانع پیدا کئے جائیں اس لئے ہمیشہ سے ایک ہی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے اور وہ ہم سب کو معلوم ہے بشیطان کو کبھی بھی انسان نے اپنے سامنے نہیں دیکھا ہے۔ اس کی وسوسہ اندازیوں نے ہمیشہ انسانوں ہی کو اپنی سواری کا گدھا بنایا ہے۔ اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ مِنَ الْجِنَّۃِ وَالنَّاسِ۔

پس شیطان اس موقعہ پر بھی اپنے ابلیسانہ تخت فساد کے ساتھ اترا اور اس نے اپنے فرماں بردار اور اطاعت شعار فرزندوں کو پیار کیا۔ جب اس کی نگاہ لطف کی ایک پر اسرار گردش ثابت قدمی کی بڑی بڑی چٹانوں کو پانی کی طرح بہا دے سکتی ہے تو پھر یہ تو اس کے سعادت مند فرزندوں کا گھرانا اور اس کے عشاق قدیم کی ایمان بکف محفل تھی یہاں تو گفت و شنود حسن و عشق اور قول و قرار، وصل و وصول کی جگہ صرف ایک تبسم امید نواز ہی دیوانہ بنا دینے کے لئے کافی تھا۔

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ می بندی
چرا بگردن حافظ نمی نہی رسنے

پس یہ اطاعت شعاران عشق اپنے پر اسرار و غیر مرئی معشوق کے حکموں کے آگے سچے عاشقوں کی طرح گر گئے اور اپنے وجود کو ایک فرماں بردار مرکب بنا کر اس کے سپرد کر دیا۔ پھر کس قدر نادان ہیں وہ لوگ جو سواری کے ایک چار پائے کی تونگایت

کہتے ہیں مگر اس کو نہیں دیکھتے جس کے ہاتھ میں اس کی لگام تھی اور جس کے بوجھ نے اس مسکین پر قابو پایا تھا۔

قرآن حکیم نے ہم کو شیطان کا ایک پورا خاصہ یہ بھی بتلایا ہے کہ وہ اپنے وفادار غلاموں کو ایک کام کا حکم دیتا ہے لیکن جب بھی وہ اس کی تعمیل کرتے ہیں تو دنیا سے کہتا ہے کہ مجھے اس کام سے کیا واسطہ؟

کمثل الشیطان اذ قال للانسان اکفر۔ فلما کفر قال انی بریٔ منک۔ (۱۶-۵۹)

ان کی مثال شیطان کی سی ہے۔ اس نے انسان کو کہا کفر و ضلالت اختیار کر۔ جب انسان نے اس حکم کی تعمیل کی تو پھر وہ الگ ہوگیا اور کہنے لگا کہ مجھے اس کام سے کوئی واسطہ نہیں۔

پس یہ بے فائدہ ہے کہ آج بھی وہ ظاہر کرے کہ مجھے اس شرارت سے کوئی واسطہ نہیں اور میں اس سے بری الذمہ ہوں کیونکہ ہمیں اس کی قدیمی عادت معلوم ہے۔ اور اگرچہ ہمیشہ سب کچھ وہی کرتا ہے لیکن ہمیشہ اپنے کو الگ دکھلاتا اور ظاہر کرتا ہے کہ اسے کوئی سروکار نہیں۔

یاد رکھو کہ شر و فساد جس قدر ہے شیطان ہی کی وسوسہ اندازی کا نتیجہ ہے ورنہ اسلام کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا فرزند بھی راہ فساد اختیار نہ کرتا۔ ان الشیطان للانسان عدو مبین۔

اسی وسوسہ اندازی کا نتیجہ تھا کہ لیگ سے پہلے بھی شر و فساد پیدا ہوا اور اجلاس کے اندر بھی۔ پس ہمارا جو کچھ بھی معاملہ ہے وہ جہل و نادانی کی ان پتلیوں سے نہیں ہے جو دنیا کے سامنے ناچ رہی تھیں بلکہ جو کچھ بھی ہے وہ اس خوفناک آسیب سے ہے جس کی روح ان کے اندر حلول کر گئی ہے۔ اور جب وہ چیخ رہے تھے

تو اس کی آواز ان کے حلقوم سے نکل رہی تھی!

اس سے بڑھ کر قابل تذکرہ شرارت ان لوگوں کی ہے جو لیگ کے گذشتہ اجلاس کے اثرات و نتائج کی نسبت طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلاتے ہیں اور اس ہنگامہ کے واقعات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں گویا انھوں نے لیگ کے اجلاس کو کھو دیا۔

لیکن ہم کو یقین ہے کہ یہ تمام کوششیں بیکار ہیں اور غلط فہمی خواہ کتنی ہی سخت ہو لیکن انسان کی بینائی نہیں چھین سکتی۔ گذشتہ اجلاس کی کامیابی و ناکامی کا اندازہ صرف اس چیز سے کیا جا سکتا ہے کہ اجلاس کا مقصود اصلی کیا تھا اور وہ حاصل ہو سکا یا نہیں۔

یہ بالکل ظاہر ہے کہ اس سال لیگ کے بمبئی میں منعقد کرنے کا کوئی مقصد اس کے سوا نہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کے مکمل اتفاق کی طرف سعی و طلب کا ایک نمایاں قدم بڑھایا جائے۔ اور موجودہ حالات و مقتضیات کے مطابق مسلمانوں کی طرف سے ایک زندہ سیاسی آواز بلند ہو سکے۔

یہی مقصد تھا جس کے لئے ایک جماعت اس بات پر اڑ گئی کہ لیگ کا اجلاس ضرور بمبئی میں منعقد کیا جائے اور اس کے فوائد کے یقین کا اس قدر اس پر استغراق طاری ہوا کہ انعقاد کی خوشی میں باہمی راضی نامہ کی ایک بدترین اور قابل نفرت شکل بھی اس نے منظور کر لی۔

یہ راضی نامہ وہ ہے جس کو سر سید علی امام کی اسی "صلح فرما" خصوصیت کا دوسرا عمل سمجھنا چاہیے جس کا پہلا عمل مسئلہ مسجد کانپور کی مشہور "صلح" ہے۔

اسی راضی نامہ کا مقصد یہ تھا کہ لیگ کے اجلاس میں سوائے تین تجویزوں کے جن کے الفاظ تک قرار پا چکے تھے اور کوئی کارروائی نہ کی جائے۔

وفاداری، توسیع عہد وائسرائے، اور ایک کمیٹی کا انعقاد۔

اب اس کے بعد واقعات پر نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ یہ تمام مفسدانہ سازوسامان جو راضی نامہ کے بعد بھی جاری رکھے گئے اس مقصد اصلی کو کہاں تک نقصان پہنچا سکے جو لیگ کے انعقاد سے مقصود اصلی تھا؟

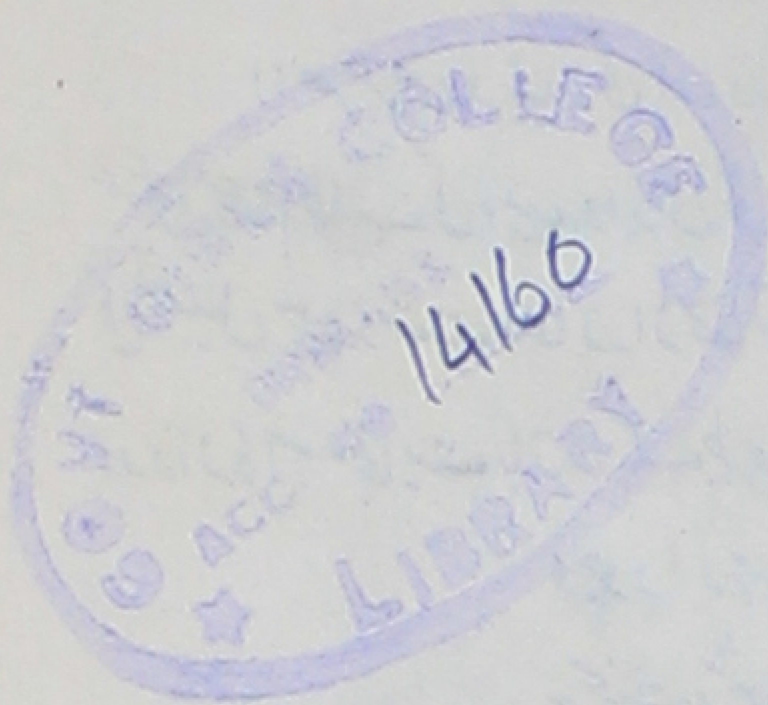
آل انڈیا مسلم لیگ، اس کے کاموں، اس کی کارکن جماعت اور اس کے سرپرستوں کے طریق عمل کے متعلق ابتدا سے ہماری ایک خاص طرح کی رائے رہی ہے۔ اور جو اُن دونوں جماعتوں کے افکار سے بالکل مختلف ہے جن کو موجودہ لیگ کے موافقین اور مخالفین کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ بااین ہمہ ہم یقینی طور پر دیکھ رہے ہیں کہ لیگ کے آغاز وجود سے لے کر اس وقت تک اگر اس کا کوئی اجتماع ایسا ہوا ہے جس کو نسبتاً مفید و کامیاب کہا جا سکے تو وہ یہی عجیب و غریب اجتماع تھا جو باوجود ان تمام مفسدانہ طاقتوں اور مفسدانہ سازوسامان مقاومت کے ساحل بمبئی پر منعقد ہوا۔

انعقاد کا پہلا مقصد یہ تھا کہ ہندو مسلمانوں کے مکمل اتحاد کی طرف ایک زیادہ نمایاں اور موثر قدم بڑھایا جائے۔ اس کو کوئی قوت فساد نہ روک سکی نہ افساد و اضلال کی طاقتوں کا وہ سب سے بڑا ہولناک بت روک سکا جس کے چہرے پر نقاب رہتا ہے اور نہ اسے مندر کے وہ پجاری روک سکے جو اس کے پر اسرار حکموں پر رقص عبادت کرتے ہیں۔ لیگ اور کانگرس کے اجلاس ایک شہر میں ہوئے۔ لیگ کے ممبر جوم رول لیگ میں شریک ہوئے اور ماڈریٹ کانگریسی پارٹی سے زیادہ اظہار جوش کے ساتھ اس کی کارروائی میں حصہ لیا۔ پھر کانگرس میں شریک ہوئے اور ممبران کانگرس لیگ میں آئے۔ یہ چیز فی نفسہ ہماری نظروں میں کوئی ایسی وقیع چیز نہیں ہے مگر چونکہ کانگرس اور مسلمانوں کی تفریق کو ہمیشہ

ایک بت بنا کر مسلمانوں نے پوجا ہے اس لئے اس کا پاش پاش ہونا ہر طرح ایک اہم واقعہ ہونے کی استعداد رکھتا ہے۔

اس سے بھی اہم تر چیز یہ تھی کہ مسلمانوں کے سیاسی مجمع سے ایک ایسی آواز اٹھے جس میں کچھ جان ہو اور جس کی روح کو فرضی اور وہمی سوال اٹھا کر ہلاک نہ کیا جا سکے سو اس میں کوئی شک نہیں کہ مسٹر مظہر الحق کا ایڈریس اس اعتبار سے لیگ کی تمام تاریخ کا حاصل زندگی ہے۔ اور باوجود ہجوم مشکلات و احاطۂ موانع کے انھوں نے جس قدر بھی اظہار حقیقت کی توفیق پائی وہ ہمیشہ یاد رہے گی۔

ان کے ایڈریس میں جو کچھ موجود ہے وہ بلحاظ وقت کی مشکلات کے اس قدر وقیع ہے کہ اس کی رفعت پر غیر موجود کا افسوس غالب نہیں آ سکتا۔



مجوّزہ شیعہ کالج (افکار و حوادث)

البلاغ ۱۸ فروری ۱۹۱۶ء

گذشتہ جنوری میں "مجوزہ شیعہ کالج" کا جو وفد ہزآنر سر جیمس مسٹن بہادر کی خدمت میں بمقام لکھنؤ پیش ہوا تھا اس کی روئداد اب تک رسالہ کی شکل میں شائع کی گئی ہے۔ روئداد کا خلاصہ یہ ہے کہ ۱۴ جنوری کو گورنمنٹ ہاؤس لکھنؤ میں ایڈریس پیش کیا گیا اور اس کے جواب میں خطاب ملوکانہ ہمایونی نے عرض و نیاز کے ایک ایک لفظ کو خلعت قبولیت پذیرائی عطا فرمایا۔

دیدار ہم میسر و بوس و کنار ہم
از بخت شکر دارم داز روزگار ہم

ادھر عرض و نیاز کی ارادت کیشی تھی تو ادھر نگاہ مہر و کرم کی عجز پروری۔ ادھر عشق کام طلب کی امیدواری تو ادھر حسن عشق نوازی کی کام فرمائی۔ ادھر "ادعونی" کی تعمیل میں دست دعا دراز تھا تو ادھر وعدۂ "استجب لکم" کی تصدیق میں دروازۂ استجابت باز۔ ایک طرف سراسر عشق تھا۔ دوسری طرف سراسر حسن۔

وجود او ہمہ حسن ست و ہستیم ہمہ عشق
بہ بخت دشمن و اقبال دوست سوگند ست

رسم و راہ کوچۂ عشق کے واقف کار جانتے ہیں کہ یہاں حق و ہنر کا سوال کام نہیں دیتا۔ بلکہ اسی دنیا کا سارا دار و مدار محض بخشش و کرم پر ہے۔ اس کی نظریں جس پر پڑ جائیں اور اس کی بے نیازی جس کو سرفراز کر دے وہی سب سے زیادہ مستحق اور

اسی میں سب سے بڑا ہنر ہے۔ استغناء اور ہنر دکھلا کر چاندی اور سونا لیا جاسکتا ہے لیکن محبت کی نظریں اور پیار کی ادائیں نہیں خریدی جاسکتیں۔ ارسطو اگر لیلیٰ کے خیمہ کا پردہ اٹھاتا اور قیس کی دیوانگی کے مقابلے میں اپنے فن منطق کو پیش کرتا تو آپ کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کیا جواب ملتا۔

معمورہ ولے اگرت ہست باز گوئے

کاینجا سخن بہ ملک فریدوں نمے رود

پس عالم حسن وعشق کے کاروبار اور رد وقبول کے احکام دوسرے ہیں اور یہاں سب سے بڑی دلیل اور سب سے پہلے چاہنے والوں کی چاہ نہیں اسی لئے ہیں کہ خود کسی کی شیفتگی کو اپنی چاہتوں کے لئے چھانٹ لے۔ پھر جس کو خود وہ چاہے اس کی قسمت کا کیا پوچھنا کہ عشق کی شہنشاہی اور اقلیم حسن کی فرماں روائی ہے۔ بن پڑے تو اپنی چاہتوں میں ان خوش نصیب کو بھی شامل کر لیجئے کہ محبوب کا محبوب بھی محبوب ہوتا ہے اور مذہب عشق کا منتہائے کمال یہی ہے۔

چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے

وہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے

مرحوم ذوق کی غزلوں میں اپنا ذوق بہت کم پاتا ہوں تاہم ایک شعر ان کا بھی یاد آگیا۔

تم جسے یاد کرو پھر اسے کیا یاد رہے

نہ خدائی کی ہو پروا نہ خدا یاد رہے

اردو شاعری میں جس چیز کو "معاملہ گوئی" کہتے ہیں۔ شعرائے ایران اسے "وقوعہ گوئی" سے تعبیر کرتے ہیں۔ اواخر عہد صفویہ میں فغانی کے اسکول نے جو شعراء پیدا کئے انھوں نے خاص طور پر اس رنگ کو بہت ترقی دی۔ ازاں جملہ ضمیری صفاہانی ہے جس

گا ایک شعر مجھے نہیں بھولتا۔

چوں می بینم کسے از کوئے او دلشاد می آید
فریبے کز وے اول خوردہ بودم یاد می آید

اس وفد نے جو ایڈریس پیش کیا تھا وہ اس قدر دلچسپ نہیں جس قدر ایڈریس کا جواب دلچسپ ہے اور ایسا ہونا ضروری تھا۔ عشق خواہ کسی شکل میں ہو، عجز و نیاز کے لئے ہے دلبری و رعنائی کے لئے نہیں ہے۔ یہ خواص حسن کے ہیں۔ اس کا کوئی جلوہ دلبری و نظارہ پروری سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ تو وہ چیز ہے کہ اگر بے مہری و غیظ و غضب میں ہے جب بھی پیار کرنے ہی کی چیز ہوتی ہے۔ پھر لطف و نوازش اور بخشش و کرم کی ہوش ربائی کا کیا پوچھنا۔

ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

ہز آنر اپنے جواب میں فرماتے ہیں۔

"اس بیان سے میرا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھ کو کسی قوم یا مذہب کے لوگوں کی کوئی خاص رعایت منظور ہے۔ نہ میرا یہ منشاء ہے کہ جو بڑی بلیغ کوششیں اب تک مسلمانوں کی ترقی تعلیم کی نسبت کی گئی ہیں ان کی بے قدری کی جائے"

لیکن ہم حیران ہیں کہ اس جملے کے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔ بھلا ایک منٹ کے لئے بھی کوئی عقلمند ہز آنر کی نسبت ایسی بدگمانی کر سکتا ہے۔؟

نہ ہم سمجھے نہ تم آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے اپنی جبیں سے

ہم نے ان کی کہا ہے کہ شیوۂ عشق و کمال شیفتگی یہ ہے کہ معشوق پر حکمرانی نہ کیجئے

بلکہ اپنے عشق کو اس کے فرمان حسن کا محکوم کر دیجئے۔ فلسفۂ حسن و عشق کے سب سے بڑے حکیم عرفی شیرازی کا قول فیصل آپ کو معلوم ہے۔

قبول خاطر معشوق شرط دیدار است!
بحکم شوق تماشا مکن کہ بے ادبیست

آپ کو اگر دعویٰ محبت ہے تو ہر اس شے کو پیار کیجئے جس پر پیارے کی ایک غلط انداز نظر بھی اس نے ڈال دی ہو۔ مذہب عشق کی منزل تفویض یہی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر مدعیان عشق و کمال عشق نے یہی شیوہ اختیار کیا ہے۔ ازاں جملہ مجمع عشاق علی گڑھ (کثرھم اللہ تعالیٰ) ہے۔ باوجودیکہ یہاں کا ہر مجنوں و فرہاد مسئلہ تعلیم و مرکز تعلیم کے بارے میں ایک لمحہ کے لئے بھی متحمل رقابت نہ تھا۔ لیکن جونہی نظر محبوب نے اپنی محبوبیت کا اعلان کر دیا، معاً سب نے ادعائے رقابت کی تلوار نیام میں رکھ لی اور اب فیصلۂ سرکار حسن کے آگے سب کی گردنیں خم ہیں۔

سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے

مسئلہ مسلم یونیورسٹی اور علوم معارف جدیدہ

(افکار و حوادث)

(البلاغ ۱۷/۳۱ مارچ ۱۹۱۶ء)

دنیا کے عجائب و غرائب کی فہرست بڑی طولانی ہے۔ شاہنامہ کے عجیب و غریب سیمرغ سے لے کر گل بکاؤلی کے عجیب الخواص پھول تک ایک سے ایک عجیب المخلوقات، اور ایک سے ایک محیر العقول ہے!

اگر بابل کے معلق باغ اور مصر قدیم کے پراسرار مندروں سے قطع نظر کر لیا جائے جن کی ملکیت کا تاریخ قدیم کو دعویٰ ہے جب بھی دیوار قہقہہ کی طلسم آرا دیوار، سکندر اعظم کا اعجوبہ زا چشمۂ حیات اور یادش بخیر حاتم طائی کی فیاضانہ سیاحتوں کے انکشافات دنیا کی دلچسپیوں کے لئے کیا کم ہیں۔

تاہم موجودہ زمانہ عقل و دانائی اور تجربہ و مشاہدہ کا عہد ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب ہم بہت زیادہ عقلمند ہو گئے ہیں اس لئے ان عجیب عجیب قصوں کو نہیں مان سکتے تو اس واقعہ کو تو مان سکتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی بلا توقف لے لینی چاہئے۔ اس لئے کہ مہاراجہ دربھنگہ اور پنڈت مدن موہن مالویہ صاحب نے لے لی۔ اور اس لئے کہ لاکھ روپیہ ماہوار ملے گا۔ اور اس لئے کہ علی گڑھ میں ہر سال تقسیم سندات کا عظیم الشان جلسہ منعقد ہوگا۔ اور اس لئے کہ برٹش گورنمنٹ رحمت الٰہی ہے۔ اور اس لئے کہ خالق اکبر نے ہم کو اس لئے بنایا ہے کہ احکامات و اوامر کی تعمیل کریں۔ اور اس

لئے کہ مسلمانوں کی مسلمہ قومی پالیسی گورنمنٹ سے اعتماد پر مبنی ہے، اور سب سے آخر مگر سب سے پہلے یہ کہ بنارس کی طرح علی گڑھ کی گلیاں بھی گزشتہ قرون کے عجیب و غریب مناظر و مشاہد کو دیکھ لیں گی اور یہ سب سے بڑی نعمت ہے جس کے لئے کوئی ذی روح اس کرۂ ارض پر بے قرار ہو سکتا ہے اور سب سے بڑی دولت کونین ہے جو آدم کی اولاد کو دنیا میں مل سکتی ہے۔ وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون۔

اگر مسلم یونیورسٹی کے بلا انتظار لے لینے کے یہ حقائق و دقائق دلیل و برہان ہو سکتے ہیں، اور دنیا میں ایسے دماغ باقی ہیں جو علمی سنجیدگی کے ساتھ ان چیزوں کو پیش کرنے سے نہیں شرماتے، اور ایسے لوگ موجود ہیں جو دلائل و شواہد کی طرح ان کو قبول کر لے سکتے ہیں تو پھر دنیائے قدیم کی کوئی روایت بھی عجیب نہیں اور بلا تامل مان لینا چاہئے کہ دنیا میں اب بھی وہ تمام عجائب و غرائب ہو سکتے ہیں، جو کسی زمانہ ماضی میں ہو چکے ہیں۔ اب ہم کو پورا یقین ہے کہ فردوسی کے سیمرغ سے نایود ہو جانے کا فیصلہ صحیح نہیں تھا۔ اس کے گھونسلے سے اب بھی "زال" پیدا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یونیورسٹی کے لے لینے سے ہی سب کچھ ہو جائے گا۔ اور اگر آپ کی آنکھیں ہیں تو اس کا صحیح علاج یہ ہے کہ "گل بکاؤلی" کو تلاش کیجئے۔ کیونکہ حقائق کے ثبوت کا دار و مدار اب صرف نقالی، حکم، اطاعت اور خوش اعتقادی و حسن ظن پر آکر رہ گیا ہے۔ اور اگر ایسا ہی ہے تو غریب تاج الملوک نے کیا خطا کی ہے کہ اسکی مشہور و متواتر روایت کو نظر انداز کر دیا جائے۔

حقیقت میں یہ واقعہ بھی دنیا کے عجائب و نوادر میں سے ہے کہ ایک طرف تو مسلمانوں کو کہا جاتا ہے کہ ان کے تمام امراض کا علاج، ان کی تمام جستجوؤں کا مقصود ان کی تمام امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز و ملجا مسلم یونیورسٹی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے

جو غرناطہ اور قرطبہ اور بغداد اور کیمبرج اور آکسفورڈ اور نہیں معلوم کیا کیا کچھ مسلمانوں کے حوالے کر دے گی۔

دوسری طرف جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اگر یہ متاع اس قدر قیمتی، اس قدر عظیم واہم، اور اس درجہ موت وحیات ملت کا فیصلہ کرنے والی ہے تو خدارا جلدی نہ کیجئے۔ بغیر کامل جدوجہد اور سعی وکوشش کے خاتمہ نہ کر دیجئے۔ ایک ہی غمزہ وتمکین طلب، پر اپنی تمام متاع دل وجان نذر نہ کر دیجئے۔ صبر واستقامت، فکر راسخ اور سعی وجہد کامل دنیا میں ہمیشہ عزائم امور کے لئے ایک حقیقت ثانیہ رہے ہیں۔ آپ بھی ان سے کام لیجئے اور ساتھ ہی اپنی اصلاح حال اور حقیقی ومعنوی ترقیات وتوسیعات میں سرگرم رہیئے کہ اصل کار یہی ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے اور چند مہینوں یا ایک سال کے اندر آپ کی ساری کائنات سعی وتدبیر غارت جا رہی ہے تو پھر خدارا آہ وواویلا نہ مچائیے، مخفی اور درپردہ کوشش نہ کیجئے۔ یہ تعلقہ داری کا مقدمہ یا جد امجد مرحوم کی وراثت کا جھگڑا نہیں ہے۔ دلائل وحقائق کا مقابلہ ہے۔ سنجیدگی کے ساتھ واقعی دلائل پیش کیجئے۔ دنیا میں عقل وفہم کی بخشش عام ہے اور آپ جیسی نہیں مگر سمجھ ہر شخص رکھتا ہے، تو پھر اس کے جواب میں یا تو بگڑ جاتے ہیں کہ تم "مسلمہ قومی پالیسی" کے دشمن ہو، یا روٹھ جاتے ہیں کہ تم ہماری بات نہیں مانتے یا پھر دلیل پیش کرنے پر آتے ہیں تو یہ فرماتے ہیں کہ بنارس میں لڈو بٹ چکے ہیں تم بھی بے تحاشا دوڑ جاؤ۔

علوم جدیدہ

اصل یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی کو بلا توقف لے لینے کے متعلق جس قدر مصنفات واسفار محققین عہد نے شائع کئے ہیں۔ ان سے مسلم یونیورسٹی کا ہندو یونیورسٹی ایکٹ

پرلے لینا ثابت ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو۔ لیکن اس میں تو کچھ شک نہیں کہ ضمناً ایک عظیم الشان کام آخر انجام پاگیا۔ ہمارا اشارہ اس جدید فن منطق کی طرف ہے جو "علمائے مسلم یونیورسٹی" نے مدون فرمایا ہے اور جس نے ثابت کر دیا ہے کہ دنیا میں ارسطو سے بڑھ کر آج تک کوئی انسان احمق نہیں ہوا۔ مسکین ارسطو کے وقت سے لے کر اس وقت تک دنیا اسی عالمگیر غلطی میں مبتلا رہی ہے کہ دعوے اور دلیل میں ربط کی ضرورت ہوتی ہے مگر یہ کیسا سفیہانہ اور احمقانہ خیال تھا۔

ہمارے محققین کا ملین نے اپنی سیث منطق کی پہلی ضرب اسی پر ماری۔ اور ثابت کر دیا کہ اس سے بڑھ کر اور غلط خیال نہیں ہو سکتا۔ دلیل کے لئے صرف ایک ہی شئے ضروری ہے۔ یعنی وہ بلا کسی درمیانی فصل کے معاً دعوے کے بعد کہہ دی جائے۔ اب رہی یہ بات کہ اس میں اور دعوے میں ربط بھی ہو تو ایسا سمجھنا ایک خالص حماقت ہے جس میں بد بخت ارسطو گرفتار تھا۔ اور کچھ ضرور نہیں کہ ہر انسان گرفتار ہو۔

اس سے بڑھ کر ان مباحث حکمیہ و فقہیہ نے جس قدیم غلطی کی ضلالت سے نوع انسانی کو نجات دلائی وہ "برہان" کی تعریف کا مسئلہ ہے۔ تمام دنیائے قدیم و جدید کس درجہ عقل و دانائی سے محروم تھی جب کہ یقین کر رہی تھی کہ "برہان" اس چیز کو کہتے ہیں جس کے مان لینے سے دعوے کا مان لینا لازم آجائے۔ حالانکہ مصنفین صحائف مسلم یونیورسٹی و مدونین اسفار مسئلہ قومی و تعلیمی نے (جن میں بڑے بڑے ماہرین فلسفہ تعلیم موجود ہیں) ثابت کر دیا ہے کہ نہ صرف یہ تعریف غلط ہی ہے بلکہ اصلی حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے۔ دعوے اور برہان میں جس قدر بعد لزومی اسی قدر وہ زیادہ صحیح اور حکمت برہان ہوگا مثلاً دعویٰ یہ ہے کہ مسلم یونیورسٹی جن شرائط کے ساتھ اس وقت مل رہی ہے بلا توقف لے لینا چاہیے۔ کیونکہ اس سے مسلمانوں کا تعلیمی و قومی مقصود حاصل ہو جائے گا۔ دلیل یہ ہے کہ ایک لاکھ روپیہ ماہوار ملتا ہے۔ اب جس وقت تک کوئی شخص روپیہ کی اسی

تعدادی اور مقداری حقیقت ثابت کو جھٹلا نہ دے۔ اس وقت تک دعویٰ غلط نہیں ہو سکتا۔

ارسطو نے شاعری کو محاکات کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ یعنی وہ کہتا ہے کہ انسان میں بالطبع نقالی کا مادہ موجود ہے۔ وہ جس حالت کو دیکھتا ہے اسی سے منفعلانہ متاثر ہوتا ہے اور اسی کو دہراتا ہے مگر مسئلہ مسلم یونیورسٹی کا محقق کہتا ہے کہ یہ اس قدیم مدعی علم کی سخت کوتاہ نظری تھی۔ شاعری ہی نہیں بلکہ قومی زندگی کے تمام اعمال و افکار علی الخصوص مسئلہ تعلیم و قومیت کا دار و مدار اسی اصول محاکات یعنی نقالی پر ہے۔ دوسروں کو جس طرح کرتے دیکھو اسی طرح خود بھی کرو۔ اگر ایک چیز کو انسانوں کی کوئی بھیڑ کر رہی ہے تو ان کا کرنا بجائے خود ایک دلیل عمل ہے۔ اس کے بعد کسی دلیل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ مسلمانوں کے تمام قومی و تعلیمی کاموں کا محور اسی حقیقت کو ہونا چاہئے ان کے لئے نہ تو کوئی چیز سیاہ ہے اور نہ سفید۔ سیاہی اور سفیدی کا معیار دوسروں کا سیاہ و سفید کہنا اور قرار دینا ہے۔ پس مہاراجہ دربھنگہ اور پنڈت مدن موہن مالویہ جی نے کہہ دیا کہ یہ چیز سفید ہے تو اب تمام مسلمانوں کو چاہیئے کہ بے چون و چرا اس کے آگے سر بسجود ہو جائیں اور اگر کہہ دیں کو بھی علی گڑھ کی فضا میں اڑتا ہوا دیکھیں تو چیخ اٹھیں کہ رنگیلا ناریل اڑ رہا ہے۔

یہ محققین عہد، ماہرین مسئلہ تعلیم، محرمان اسرار و رموز قومیات و تعلیمات جدید اور مجددین و مصلحین عنصر تعلیمی کی جماعت تھی۔ لیکن ان کے بعد ارباب سلوک و معرفت و اصحاب حقائق و معارف کا ایک مقدس گروہ سامنے آتا ہے اور علمی طرز بحث کی جگہ عارفانہ انداز بیان کے ساتھ کہتا ہے کہ یہ مقام استدلال و براہین کا نہیں بلکہ ذوق و وجدانیات و جذبات کا ہے۔

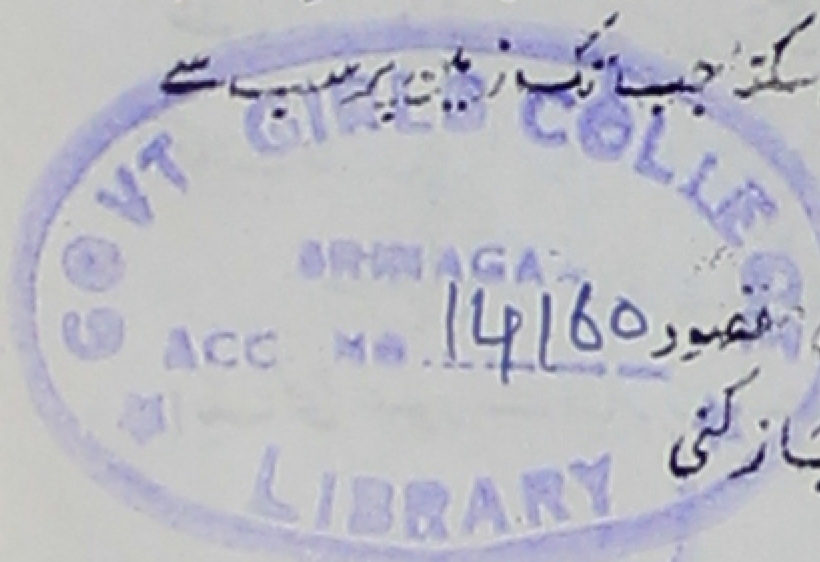
گر باستدلال کار دیں بدے   فخر رازی راز دار دیں بدے

جب مذہب اور مذہب کے اعتقادات جیسی اہم و عظیم چیز کے متعلق غزالی اور رازی کا فتویٰ ہے کہ اس مقام کو استدلال و عقلیات سے نہیں بلکہ ذوق و وجدان سے طے کرو تو پھر یونیورسٹی کے متعلق دلیل و برہان کا طلب کرنا کب جائز ہو سکتا ہے؟ اگر خدا کے وجود و صفات کا ثبوت عقل و دلیل سے نہیں بلکہ صرف وجدان و جذبات کے اعتراف سے ملتا ہے تو پھر مسلم یونیورسٹی کی ذات و صفات کے متعلق یہ مغرورانہ کاوش عقل و ذہن کی کیوں ہے؟ وہ مقام دوسرا ہے۔ یہاں عقل کے دعووں سے کام نہیں چلتا۔ اس یونان کدۂ اسرار و معارف کا سب سے بڑا افلاطون وہ ہے جو سب سے زیادہ بے عقلی و نادانی کا اقرار کرے۔ یہاں فلسفہ عقل کی پرستش نہیں ہوتی۔ اس عالم میں بقراط کی طب، ارسطو کی منطق اور افلاطون کی اشراقیات سے کہیں زیادہ اس چرواہے کی بے وقوفی مقبول ہے جو مولانا روم کی کائنات قصص و حکایات ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے ایک جنگل میں ملا تھا اور وہ خدا کو اپنے صحرائی جھونپڑے میں دعوت دینا چاہتا تھا تاکہ اپنی بکریوں کا دودھ پلائے۔

ملت عشق از ہمہ دیں ہا جداست

عاشقاں را ملت و مذہب خداست

پھر کیا تم نے نہیں سنا کہ خدا کے مقدس نوشتے کیا کہتے ہیں۔ حضرت مسیح نے عقل کا دعویٰ کرنے والوں کو سانپ کے بچوں کا تاریخی لقب عطا فرمایا اور کہا کہ تو آسمان کی بادشاہت میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک زمانے میں سب سے زیادہ نادان و بے عقل نہ بن جائے۔



نازکی نہ بود بے بہ منزل مقصود

مگر طریق رہش از سر نیاز کنی

مشہور ہے کہ امام فخرالدین رازی نے دو سو دلیلیں خدا تعالیٰ کے وجود کے اثبات میں جمع کی تھیں۔ اور اعلان کر دیا تھا کہ ہم نے اس راہ کو عقل کی رہنمائی میں طے کر لیا۔ یہ خبر سن کر شیطان نے اپنا بھیس بدلا اور مجلس درس میں آ کر امام رازی سے مباحثہ شروع کر دیا۔ جو دلیلیں انھوں نے تمام عمر کی کاوش سے قائم کی تھیں، یکے بعد دیگرے پیش کرتے اور شیطان ایک دو اعتراض کر کے ان کو باطل کر دیتا۔ یہ حال دیکھ کر امام صاحب بہت پریشان ہوئے اور اللہ کے حضور اپنے عجز کا اقرار کیا۔ خواب میں دیکھا کہ ایک شخص کہہ رہا ہے۔ اب دلیلوں کو چھوڑ دو۔ یہ دلیل و استدلال کا مقام نہیں ہے۔ یوں کہو کہ بغیر کسی دلیل کے کہتا ہوں کہ "خدا ہے اور اس کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا"۔ بزرگان طریقت روایت کرتے ہیں کہ انکار دلیل کی یہ آخری دلیل امام رازی نے پیش کی تو شیطان نے عاجز و درماندہ ہو کر ایک نعرہ مارا اور راہ فرار اختیار کی کہ اس دلیل کا جواب میرے پاس کوئی نہیں۔ یہی حال دیکھ کر مولانا روم نے کہہ دیا تھا۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود
پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

چنانچہ خانقاہ مسلم یونیورسٹی کے پیر طریقت بھی ایسا ہی فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوا ہے کہ دلیلوں کا یہ مقام نہیں۔ بغیر کسی دلیل کے ہم کہتے ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کو جلد سے جلد لے لینا چاہیئے اور حق اسی میں ہے۔ اگر معلم الملکوت اس آخری ملکوتی و لاہوتی دلیل کو سن کر چیخ اٹھا تھا، تو ہزار حسرت و افسوس انسان کے قلب غافل پر، اگر اس دلیل کو سن کر بے اختیار رو نہ پڑے۔

نیز فرمایا کہ مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ دلائل و شواہد سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ ایک لمحۂ تصور سے عبارت ہے جو صالح اعتقاد اور صاف و پاک ذہن کے ساتھ

میسر آجائے۔ دنیا کی تمام اشیاء و موجودات کا مشاہدہ آنکھیں کھول کر کرتے ہیں۔ مگر یہ وہ سرِّ لاہوتی و رمزِ ناسوتی ہے جس کا مشاہدہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا۔ جب تک آنکھیں اچھی طرح بند نہ کر لیجئے۔

ہاں آنکھیں بند کیجئے اور چشم تصور سے کام لیجئے۔ مسلم یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے اور سینٹ ہال میں انعامات و سندات کا عظیم الشان جلسہ منعقد ہے ایک مسلمان والی ریاست یا کوئی بڑی قومی شخصیت جس کے چانسلر ہونے کا گورنمنٹ گزٹ نے اعلان کر دیا ہے، با کمال شوکت و ابہت و با یک دنیا عظمت و رفعت ہمریر آرائے مسند چانسلری ہے۔ تمام معلمین و اساتذہ یونیورسٹی کی جماعت اپنے مدارج علمیہ کے مطابق شاندار اور طویل الذیل جبے پہنے ہوئے تمکنت افلاطونی عظمت سقراطی اور شان یونانی و رومانی کے ساتھ یمین و شمال رونق افزا ہے، اور یکے بعد دیگرے حاملین علوم و فنون مراتب عالیہ تعلیمیہ کے مقدس غول بڑھتے ہیں۔ اور سند یکف اور جبہ بدوش ہو کر واپس جاتے ہیں۔ اللہ! اللہ! کون ہے جو ایک لمحہ کے لئے بھی اس بہشت تعلیمی و جنت قومی کے منظر روح پرور کو دیکھ لے اور پھر اس کے عشق جنوں آور سے مست و لایعقل نہ ہو جائے؟ یونیورسٹی سے پیش کردہ ہزار ہا نقائص ایک طرف، اور اس منظر قومی و تعلیمی کا نظارۂ یک لمحہ ایک طرف، اگر مسلم یونیورسٹی میں اور کچھ نہ ہوتا اور صرف سال بھر میں ایک بار اسی منظر جان نواز و مشہد روح پرور کا ایک نظارہ میسر آجاتا، جب بھی یہ سودا اس قدر ارزاں تھا، گویا گرد و خاک کی ایک مٹھی دے کر بہشت شداد مول لے لی!

البتہ یہ ایک خالص "تعلیمی مسئلہ" ہے اور اس کو صرف عرفاء تعلیم و کاملین حقائق قومیہ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ شرف قزوینی نے انہی حقائق و معارف کے متعلق کہا ہے۔

بیا کہ مسئلۂ عشق ازاں دقیق ترست
کہ حل شود بشرف از فکر باطل ہمہ کس

نامحرمانِ اسرار کا یہاں گذر نہیں
لیکن زمیں را آسمانے دیگر است

بعض ارباب اشارات و اصحاب معارف سے یہ بھی منقول ہے کہ اگر قوم کی دیدۂ بصیرت بینا ہوتی تو بنارس ہندو یونیورسٹی کا گذشتہ جلسہ فہم حقیقت کے لئے بس کرتا تھا۔ سبحان اللہ! کیسا عجیب و غریب منظر تھا جو چشم فلک نے پہلی مرتبہ خاک ہند میں دیکھا۔ عظیم الشان والیان ریاست کا ہجوم اعلیٰ ترین حکام و فرماں روایان ملک کا اجتماع، شوکت و عظمت قدرت کا عدیم النظیر مظاہرہ۔ اور تعلیمی فرمانفرمائی و خسروی کے عہد حکومت کا افتتاح! اس سے بڑھ کر ایک قومی یونیورسٹی کے لئے اور کیا ہوسکتا ہے۔ کیا یہ منظر اس کے لئے کافی نہیں ہے کہ قوم کی آنکھیں کھلیں اور وہ بھی کسی نہ کسی طرح یونیورسٹی لے لینے کے لئے پاگل ہوجائے؟ افسوس ہے کہ قوم میں ماہرین "مسئلہ تعلیم" کا قحط الرجال ہے اور "عملی کام" اور "مسئلہ قومی تعلیم" کے حقائق و اسرار سمجھنے والے ناپید ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ روز بد دیکھنا نصیب نہ ہوتا! لوگ کیسی تمسخر انگیز غلطی کرتے ہیں جب کہ کہتے ہیں کہ قومی یونیورسٹی کسی بڑے جلسے، کسی بڑے مجموعہ عمارت اور ناموں اور رسموں کے کسی طول و طویل سلسلے کا نام نہیں ہے! اور اسم و رسم کا نام نہیں تو اور کس چیز کا نام ہے؟ یہ نادان ہندو یونیورسٹی ایکٹ کو دیکھتے ہیں اور صرف اختیارات، عہدہ وائس چانسلر کی منظوری اور عدم منظوری ریگولیشنز کا انتظار، وغیرہ وغیرہ، چند الفاظ انھوں نے سیکھ لئے ہیں، حالانکہ حقیقتاً یونیورسٹی نہ تو ان جزئیات و فروعات میں ہے اور نہ

اختیارات کا مسئلہ فی نفسہٖ کوئی قابل توجہ شے ہے۔ اصل حقیقت تو وہ نقرئی ہتھوڑا تھا جس سے بنارس میں ہندو یونیورسٹی کا سنگ بنیاد نصب کیا گیا، اور اگر ایک ایسے ہی نقرئی ہتھوڑے کی با عظمت ضرب سرزمین علی گڑھ کو نصیب ہوگئی، تو ساری مشکلیں حل، اور ساری امیدوں کے لئے پیام بشارت ہے!

افسانۂ زلف یا مسلم یونیورسٹی

البلاغ ۱۷-۳۱ مارچ سنہ ۱۹۱۶ء

اولا یرون انھم یفتنون فی کل عام مرۃ او مرتین ثم لا یتوبون ولا ھم یذکرون۔

(توبہ)

کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ کوئی برس ایسا نہیں گزرتا کہ ایک بار یا دو بار بلاؤں میں نہ ڈالے جاتے ہوں۔ پھر بھی ان کی غفلت کا یہ حال ہے کہ نہ تو توبہ کرتے ہیں اور نہ واقعات وحوادث کی تنبیہوں اور سرزنشوں سے نصیحت پکڑتے ہیں۔

رات اور زلف کا یہ افسانہ
قصہ کوتہ، بڑی کہانی ہے

مسئلہ مسلم یونیورسٹی کی گذشتہ سہ سالہ تاریخ جن واقعات وحوادث سے عبارت ہے۔ میں ان کو اس وقت بہ تفصیل نہیں دہراؤں گا کیونکہ واقعات ابھی اس قدر پرانے نہیں ہوئے ہیں کہ حافظہ کے لئے تجدید ذکر کی ضرورت ہو۔

نفس تجویز کی ابتدائی تحریک، گورنمنٹ کا اولین مراسلہ، فونڈیشن کمیٹی کا پہلا انعقاد، ڈیپوٹیشن کی تشکیل وشکست۔ فونڈیشن کمیٹی کا دوسرا اجلاس علی گڑھ، پھر مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن کا قیام، علی الخصوص اس کا پچھلا اجلاس یہ اور نیز ان واقعات وحوادث کے بے شمار اطراف ونتائج نہ صرف مسلم یونیورسٹی نامی کسی مسئلہ کی سرگذشت ہے بلکہ مسلمانوں کی گذشتہ سہ سالہ حیات قومی و

اجتماعی کی ایک ایسی مکمل تاریخ ہے جس میں اس تیرہ سال کے اندر کی ہر چیز دیکھی اور پڑھی جا سکتی ہے۔
علی الخصوص حق و باطل اور اصلاح و فساد کی باہمی آویزش اور حق کے قدرتی اور لازمی خواص، فتح و نصرت کے ظہور و اعلان کے لحاظ سے تو مسئلہ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ اس درجہ پر عبرت و بصیرت ہے کہ اگر ہندوستان کے اور تمام واقعات و حوادث سے قطع نظر کر لیا جائے تو صرف یہی واقعہ اس حقیقت کے اعلان کے لئے بس کرتا ہے کہ حق جاگ اٹھا ہے۔ اور جب وہ جاگ اٹھے تو پھر باطل کے لئے امن و بقاء نہیں ہے۔

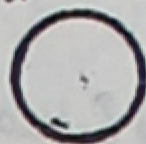


مسئلہ مسلم یونیورسٹی کے واقعہ کو دنیا خواہ کچھ ہی سمجھے مگر میں نے اس میں ایک ہی چیز کو دیکھا اور ہمیشہ اس سے ایک ہی طرح کی صدائیں سنیں۔ میں نے دیکھا کہ حق و باطل معرکہ آرا ہیں اور گو مختلف صداؤں، مختلف ناموں اور مختلف شکلوں میں منظر آرائیاں ہو رہی ہیں مگر ان کے اندر بجز حق و باطل کے مقابلے کے اور کچھ نہیں ہے۔ میری یہ صاف نگاہی بہتوں کو خوش نہ آئی۔ اور بہتوں نے کوشش کی کہ اس قدر صاف لفظوں میں مطلب نہ کہا جائے لیکن میں اپنے مشاہدے کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ الحمدللہ کہ ابتدا سے لے کر اس وقت تک میں نے جو کچھ دیکھا صاف صاف کہا اور کوئی سعی، کوئی آرزو، کوئی قوت میری نگاہ کو گرد آلود نہ کر سکی۔

بندۂ را کہ بفرمان خدا راہ رود
نگذارند کہ در بند بیجا ماند

غور کرو کہ اس تمام عرصہ کے اندر یکے بعد دیگرے کیسے کیسے واقعات

پیش آئے اور کس طرح ہر موقعہ پر حق نے بتلا دیا کہ وہ کہاں ہے اور باطل نے دیکھ لیا کہ خصائص حق کا قانون کس طرح اٹل اور غیر متغیر ہے۔



اس سلسلے میں سب سے پہلے وہ زمانہ یاد آتا ہے جب پہلے پہل مسلم یونیورسٹی کے متعلق دنیا نے معلوم کیا ہے کہ جن امیدوں اور ولولوں میں ان کو مبتلا کیا تھا ضروری نہیں کہ اصلیت ایسی ہی ہو۔ اس زمانے میں الہلال نیا نیا شائع ہوا تھا۔ اس نے مسلسل چار اشاعتوں میں تعلیمی ممبر کے اولین مراسلہ پر بحث کی اور مسلم یونیورسٹی کی تحریک اور اس کے دعاۃ واعظین کے متعلق خصوصاً اور تمام قومی تحریکوں اور جماعتی کاموں کے متعلق عموماً ان افکار اسلامیہ اور عقائد صحیحہ کا اعلان کیا جن کی صداؤں سے سرزمین ہند کی اسلامی آبادی اس وقت تک آشنا نہ ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ مقالات بھی الہلال کے ان ابتدائی مقالات میں سے ہے جنہوں نے مسلمانان ہند کے آگے سب سے پہلے اسلام کے احکام دینیہ و اوامر شرعیہ کی بنا پر حریت فکر و اجتہاد رائے و دعوت الی الحق و توحید معرفت و احتساب شرعی کی دعوت پیش کی۔ اور جس کو چند مہینوں کے اندر حکمت الٰہی نے وہ فتح مندانہ نشر و اعلان اور خسروانہ قبولیت و رفعت عطا فرمائی کہ وہی دعوۃ۔ وہی پکار۔ وہی الفاظ وہی جملے۔ وہی ترکیبیں۔ وہی عقائد ہزاروں انسانوں، صدہا جماعتوں، بڑی بڑی آبادیوں بڑے بڑے شہروں بلکہ مسلمانان ہند کے سب سے زیادہ وسیع و غالب حصے کی زبانوں سے نکلنے لگے۔ حتیٰ کہ بہت سے ایسے لوگ بھی جو اس وقت دعوت الہلال کے اشد شدید منکرین و جاحدین میں سے تھے۔ دوسرے ناموں اور بھیسوں میں آکر انہی عقائد کا وعظ کرنے لگے اور سلطان حق کی قہرمانیت و شہنشاہیت کے آگے سر بسجود ہو جانے کے لئے مجبور ہو گئے۔

گر گفتۂ ز عشق گہے حرف آشنا
آں ہم حکایتیست کہ از من شنیدۂ

چونکہ اس وقت تک انقلابی دور دعوۃ شروع نہیں ہوا تھا اور ستعرادو فکر وا سر ز مین دتقلید اشخاص و اتباع ازکار مالوف دمتوارثہ کی بندش مر جماعت اور ہر فرد کے لیے زینت یاد گردن بنیں، اس لیے اس سلسلہ مقالات کا شائع ہونا تھا کہ ہر طرف سے رد و انکار کی سر ائیں اٹھنے لگیں، اور ان لوگوں نے جن کی تمام عمر انسانی پرستشوں اور طرح طرح کی دنیاوی طاقتوں کی عبودیتوں میں بسر ہوئی تھی۔ حیران کے پلانا شروع کیا۔

اجعل الالہۃ الھا واحدا ان ھذا لشیء عجاب (۳۸:۵) — کیا اس شخص نے تمام معبودوں سے انکار کر کے صرف ایک ہی معبود قرار دیا ہے؟ یہ تو بڑی ہی عجیب بات ہے

بعضوں نے سب سے بڑی وجہ انکار یہ بتلائی۔

ما سمعنا بھذا فی الملۃ الاخرۃ ان ھذا الا اختلاق (۳۸:۷) — ہم نے ایسی بات تو کبھی اپنی پرانی ملت میں نہ سنی۔ کچھ نہیں، یہ اس شخص کی گھڑی بات ہے۔

بہتوں نے عاجز آکر وہ آخری صدائے باطل بھی بلند کی جو اس وقت سے بلند ہوتی آئی ہے جب سے حق کی دعوت اور پکار موجود ہے۔

حرقوہ وانصروا الھتکم ان کنتم فاعلین (۲۱:۶۸) — اس کو جلا دو اس کو ہلاک کر دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو اگر تم حقیقت میں کچھ کرنے والے ہو۔

حتی کہ بعض ایسے مخصوص افراد بھی جن کے افکار و عزائم میں تبدیلی ہو چکی تھی اور آزاد

بربانیوں کی راہ پر چلنا چاہتے تھے، لیکن یک قدیم اثرات سے پاک نہ ہو سکے۔ اور الہلال
کی صدائیں ابتدا ابتدا میں انھیں کبھی خوش نہ آئیں۔ لیکن کچھ غور کرو کہ چند دنوں کے بعد ہی
ان حالات کا نتیجہ کیا نکلا؟ دنیا کی ان نظروں نے جو ایک غیر معلوم مدت سے حق و باطل کے
ان گنت معرکے دیکھ چکی ہیں۔ اس معرکے میں بھی کیا دیکھا؟ کس کے ساتھ اللہ سبحانہ نے
اس کو منزل کی جگہ عروج، ادبار کی جگہ اقدام، شکست کی جگہ فتح، اور ذلت و رسوائی کی
جگہ عظمت و رفعت بخشی؟ اور کون تھے جن کو روز بروز ناکامی و نامرادی اور ذلت و خسران
کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آیا؟ کس کے ساتھ سچائی جو ہمیشہ "لا خوف علیھم ولا ھم
یحزنون" اور "لھم البشری فی الحیوۃ الدنیا وفی الآخرۃ" کا مصداق رہا ہے
اور کون ہے رشتہ حق و صدق سے محروم تھا جس نے "ان الباطل کان زھوقا" کے سوا اور کچھ
نہ پایا۔ اس کا جواب میں خود نہ دوں گا۔ ان سوالوں کا جواب ہندوستان کے زمین و آسمان
سے پوچھو۔ خاک ہند کے ایک ایک ذرہ سے پوچھو۔ ہر اس ستارے سے پوچھو جو گذشتہ
تین سال کے اندر ہندوستان کی راتوں میں نکلا اور آفتاب کی ہر اس کرن سے پوچھو جو پچھلے
تین سالوں کی ہر صبح کو چمکی اور ہر شام کو غروب ہوئی اور اگر یہ تمام صدائیں بھی اس کے لئے کافی
نہ ہوں تو پھر خود انہی ہستیوں کے پاس جاؤ جنھوں نے صدائے حق کے انکار و جحود میں منکرین
سابقین اور جاحدین اقدمین سے اپنا رشتہ جوڑا ہے۔ اور ان کے پہلوؤں کے اندر اتر کے دیکھو کہ
دل کا ایک ایک گوشہ اور اس کی گہرائی میں کا ایک ایک ریشہ کیا کہہ رہا ہے؟ کس ناکامی کا داغ
ہے اور کس نامرادی کا ماتم۔



اس عہد کے بعد ہی نہ صرف مسلم یونیورسٹی کی تاریخ، بلکہ مسلمانان ہند کے اعمال
و افکار عمومی کی تاریخ کا وہ مشہور اور یادگار واقعہ پیش آیا۔ جو بصیرتوں کا ایک صحیفہ عبرتوں
کا ایک سرچشمہ اور قلوب مومنین و ارواح صادقین کے لئے عظمتوں اور حکمتوں کی روشنیوں کا

کا ایک آفتاب عالمتاب تھا
لمن کان له قلب او القی السمع وهو شهید (۵۰: ۲۲) یعنی فونڈیشن کمیٹی کا پہلا
اجلاس ۲۲ دسمبر ۱۹۱۳ء کو قیصر باغ لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ آہ کیا دنیا میں ایسی غفلتیں بھی
بسی ہیں جن کے جگانے کے لیے زلزلوں اور آتش فشانیوں کے دھماکے بھی بیکار ہوتے ہیں اور
کیا ایسی آنکھیں بھی موجود ہیں جن کے لیے دوپہر کے سورج میں بھی روشنی نہیں ہے؟ فونڈیشن کمیٹی کا
یہ اجلاس اور اس کے نتائج دعوات ظاہری اعلان زوال نسخ صداقت کا ایک ایسا تاریخی واقعہ
تھا کہ اگر لوگوں کے دلوں کو حق و انابت اور خشیت ایمانی کا ایک ذرہ احساس بھی طاری ہوتا تو رایت
یابی اور توجہ و رجوع الی الحق کے لیے صرف یہی ایک واقعہ بس کرتا تھا۔ وہ سمجھ جاتے کہ حق کس کے ساتھ
ہے اور اللہ کی مشیت کا ہاتھ کس کی جانب سے حرکت کر رہا ہے؟ وہ اعلان ذکر اور انقلاب
وقت و انکار کی روشنیوں کی ایک ایسی تجلی دوپہر تھی کہ اندھوں کو بھی راہ مل جاتی تھی اور نابیناؤں
کو بھی روشنی سے چمک اٹھنا تھا۔ لیکن افسوس انسان کی غفلت پر اور صد حسرت دلوں کے
امراض اور عقلوں کی ضلالت پر کہ سرگشتگان خواب و سرمستی کی رات اس پر بھی ختم نہ ہوئی اور
حق پرستی کی راہ اس طرح ان کے سامنے سے گم ہو گئی کہ ایسی واضح اور آشکارا رہنمائیوں کے
بعد بھی صراط مستقیم پر قدم نہ رکھ سکے۔ وما تاتیهم من آیات ربهم الا کانوا
عنها معرضین۔

کیا ممکن ہے کہ ایک صحیح الفکر دماغ اسی واقعہ کو دیکھے اور پھر بھی معلوم نہ کر سکے کہ خدا
کیا چاہتا ہے؟ ہزارہا انسان ہیں جنہوں نے ابھی اس منظر کو نہیں بھلایا ہوگا جب کہ ۲۸ دسمبر کی صبح
کو فونڈیشن کمیٹی کے اجلاس کی آخری نشست ہوتی ہے۔ اور ریزولیوشن بالاتفاق رائے
پاس کرانا چاہا ہے۔ کہ ۲۶ آدمیوں کی ایک جماعت کو اسی مسئلہ کے رد و قبول کا پورا اختیار
دے دیا جائے۔ کیسا غرورانہ اعلان، کیسا فتح مندانہ گھمنڈ، کیسا مالکانہ حکم اور کس درجہ
شادمانی و مسرت کا بے خودانہ و سرشار از جوش و خروش تھا۔ جب دو روز کی متصل مخفی

تدابیر کے بعد طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلانے کا کام انجام کو پہنچایا گیا اور بظاہر اس پورے مجمع میں مجھ کو اپنی صدائے حق کے اعلان و انذار کے لیے تن تنہا چھوڑ دیا گیا، پھر وہ یادگار اور ناقابلِ فراموش گھڑی، جب میری آواز کو قریب خود دنا مجمع نے قبول نہ کیا اور نادان انسان یہ نہ سمجھے کہ جس آواز کو اس وقت رد کر رہے ہیں، قریب ہے کہ اس کے بعد سے اس کے ماننے اور اس کی اطاعت کرنے کے لیے ان کو بے قرار ہونا پڑے گا۔ اس کے بعد ان قابلِ رحم روحوں کا شور و غل، جن کے اندر بجز نادانی، غلط فہمی اور کچھ نہ تھا۔ اور ساتھ ہی اس ریزولیوشن کے پاس کرنے کا بادشاہانہ اعلان، جس نے خوشیوں اور شادمانیوں کی مستی سے نادانوں اور بے خبروں کو متوالا کر دیا تھا۔ وزین ذالک فی قلوبکم وظننتم ظن السوء وکنتم قوماً بوراً (۴۸: ۱۲)

با ایں ہمہ نتیجہ کیا نکلا؟ فتح مندیوں اور کامرانیوں کے اس اعلان نے کتنی عمر پائی؟ کامیابی و نصرت کا یہ گھمنڈ جس نے اپنی بڑائی کا اعلان کیا تھا۔ حالانکہ بڑا صرف خدا ہے، کتنی مدت تک زندگی پا سکا؟ بلاشبہ ۲۸ کی صبح کو چند سو آدمیوں کے مجمع میں مجھ کو شکست دے دی گئی۔ لیکن اس کے بعد کتنی صبحیں فتح و کامیابی کی نصیب ہوئیں۔ اور صبح صرف ۲۸ دسمبر ہی کی نہ تھی؟ کیا ایسا نہیں ہوا کہ ابھی پورے چار مہینے بھی نہیں گذرے تھے کہ العاقبۃ للمتقین کی درستی و حقیقت یکایک نمایاں ہوئی اور وھموا بما لم ینالوا کے قانونِ فطرت نے ظاہر ہو کر بتلا دیا کہ فتح کس کے لیے اور شکست کے لیے کون ہے؟ اور پھر کیا یہ سچ نہیں ہے کہ جو ریزولیوشن اس کا جبہ غرورِ اسکندری اور نشاطِ جمشیدی کے ساتھ پاس کیا گیا تھا بالآخر بلا ادعا سر ہوا۔ اور جس ریزولیوشن کی دیوار اتنی محنتوں اور مشقتوں سے چنی گئی تھی اس کو اپنے ہاتھوں گرانا پڑا۔ اللہ اللہ اس قدوس حکم کی مصلحتیں اور اس حی قیوم کی قدرتیں، جن ہاتھوں نے اس ریزولیوشن کی تجویز کی کامیابی پر خوشیوں سے مست ہو کر دس دس منٹ تک تالیاں بجائی تھیں، انہی ہاتھوں کو میں نے دیکھا کہ زمین

کھود رہے ہیں اور اس چار ماہ طفل نو مولود کو سپرد خاک کر رہے ہیں !! اگر عقل سر نہ گئی ہو اور ایمان باللہ کی روح نے جسم کو چھوڑ نہ دیا ہو، تو کلمۂ حق و صدق کی کامیابی اور دعوۃ الہلال کی فتح مندی کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا نشانی ہو سکتی ہے۔

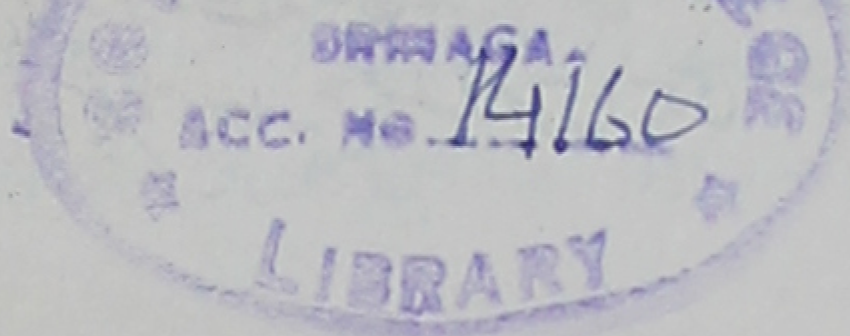
لیکن و من لم یجعل اللہ لہ نوراً فما لہ من نور

لیکن مسئلہ مسلم یونیورسٹی کی تاریخ اس واقعہ پر پہونچ کر ختم نہیں ہو جاتی۔ اگر انسان غفلت حق کی طاقت کو بار بار آزمانا چاہتا ہے تو حق بھی اپنے خواص کے بار بار اظہار کا اعلان سے نہیں تھکتا۔ فونڈیشن کمیٹی کے اولین اجلاس اور مجوزہ ڈپوٹیشن کے حادثہ نے اگرچہ بتا دیا تھا کہ آگ کا خاصہ حرارت ہے اور اس کے چھونے سے ہاتھ جل جاتا ہے لیکن نادانوں نے چاہا کہ انگاروں سے کھیلنے کا تجربہ ابھی اور جاری رکھیں چنانچہ اس کے بعد علی گڑھ میں فونڈیشن کمیٹی کا دوسرا اجلاس کیا گیا۔ بڑوں بڑوں نے بڑی بڑی کوششوں اور تدبیروں سے وہ اپنے ہم مشرب اشخاص مختلف اطراف ہند سے جمع کیے گئے، خاص علی گڑھ میں جلسہ منعقد کر کے یقین کیا گیا کہ ہمارے دار الخلافہ کے اندر اور باہر کی کوئی جماعت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ظنوا انھم مانعتھم حصونھم من اللہ انہوں نے گمان کیا کہ ہمارے قلعہ کی عمارتیں اللہ کی طاقت کو آنے سے روک دیں گی۔ فاتاھم اللہ من حیث لم یحتسبوا۔ پس خدا اسی راستے آیا۔ جہاں سے ظہور طاقت کا انہیں گمان بھی نہ تھا۔ وقذف فی قلوبھم الرعب۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اپنے دنگل کے اندر جلسہ کر کے بھی بالآخر ناکام رہے۔ اور کلمہ حق کی ہیبت اس طرح ان کے دلوں پر چھا گئی کہ باوجود کمال جد و جہد کے کچھ بھی نہ کر سکے، اور داعیان حق نے جو کچھ چاہا وہی ہوا۔ ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون۔

پھر اسی جلسہ میں مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن قایم کی گئی۔ اور اس کے ضمن میں

متعدد جزئی واقعات پیش آئے۔ مگر ہر جزئی سے جزئی واقعہ بھی قوت حق و غلبہ ارادہ ملت کی طاقت اپنے آثار و شواہد دکھلاتی رہی۔ اس اس میدان کے کسی گوشہ نے بھی ان کو پیادہ ندی حتیٰ کہ گذشتہ اجلاس ایسوسی ایشن کا آخری واقعہ پیش آیا جس میں مخفی طاقتوں اور در پردہ تدبیروں کو منتہا سعی تک پہنچا دیا گیا۔ جنگ کے زمانے کے شدید اثرات۔ بعض آزاد خیال افراد کی نظر بندیاں، ایک عرصہ کے التوا، خارشی کی وجہ سے عام طور پر دلوں کی افسردگی جنگ کے زمانہ کی وجہ سے آزادانہ خیالات کے اظہار کی عام طور پر بندش۔ اور ابرت سے ایسے وقتی حالات و اسباب پیش نظر تھے جن کی وجہ سے ان لوگوں کو پورا یقین ہو گیا تھا کہ موجودہ فرصت حصول مقصد کے لیے سب سے زیادہ قیمتی ہے۔ اور کچھ عجب نہیں کہ تمام کے دعاوی علی گڑھ کی کوششوں سے پورے ہو جائیں۔ اس اجلاس کے انعقاد کی سرگزشت بھی اس سے کم دلچسپ نہیں ہے۔ جس قدر اجلاس کے اندر کے واقعات دلچسپ ہیں۔ دوسری فونڈیشن کمیٹی میں طے پایا تھا کہ ایک ڈیپوٹیشن آخری گفتگو کے لیے وائسرائے ہند کی خدمت میں حاضر ہو۔ اب اس کے تمام مراتب ابتدائی طے پا چکے تھے۔ لیکن صورت حال یوں ٹھہرائی گئی کہ گویا ڈیپوٹیشن کے آنے کی اسی طرف سے درخواست کی گئی ہے۔ اور وہاں سے جواب صاف مل جائے کہ جب تک اصول شرائط ہندو یونیورسٹی کے منظور نہ کر لیے جائیں اس وقت تک ڈیپوٹیشن کا آنا بیکار ہے اس سے مقصود یہ تھا کہ مسلمانوں کے سامنے یونیورسٹی کا مسئلہ آخری رد و قبول کی شکل میں آجائے اور لوگ گھبرا کے اور پریشان ہو کے فیصلہ کر دیں کہ جب اس طرح دو ٹوک جواب مل گیا ہے تو اسے لینے کے سوا چارہ نہیں۔

لیکن باایں ہمہ اس سعی کا بھی جو نتیجہ نکلا وہ دنیا کو معلوم ہے۔ بالآخر اسی ناکامی نے ان کا استقبال کیا جو اولین اجلاس فونڈیشن کمیٹی سے ان کی رفیق حال و ہمدم اعمال ہے۔ اور بجز اس کے کہ تنور میں ایک نئے ماتم کا اور حسرتوں میں ایک نئی حسرت کا اضافہ ہو گیا۔ اس پورے گروہ کو اور کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔





اب ۱۰/ اپریل کو پھر فونڈیشن کمیٹی کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد کیا گیا ہے اور یہ لوگ
تین سال کے متواتر و مسلسل تجربہ کے بعد اب پھر اٹھے ہیں کہ خدا کو اور اس کے کلمۂ حق کی قوت
کو ایک بار اور آزمالیں۔ یہ محض فونڈیشن کمیٹی کا ایک جمع ہی نہیں ہے بلکہ ان کوششوں اور
تدبیروں کی انتہا ہے۔ جو مشیت الٰہی کے مقابلے میں انسانوں کا کوئی گروہ کر سکتا ہے۔ ان
لوگوں نے سمجھا ہے کہ اگر ہم ایک مرتبہ آخری جانبازانہ کوششوں کا سامان اور کرلیں گے تو ضرور خدا
کو شکست دیں گے۔ کیونکہ انسانوں کی طرح لڑتے لڑتے وہ بھی تھک جا سکتا ہے اور اگر بہت
زیادہ روپیہ، بہت زیادہ سازشیں، بہت زیادہ انسان اور بہت زیادہ انسانی تدبیروں کا مواد
جمع کر لیا جا سکے۔ تو کیوں نہیں خدا کو بھی ہار مان لینی پڑے! چنانچہ مہینوں سے طرح طرح کے
سامان کیے جا رہے ہیں اور بڑے بڑے دعوے اور بڑے بڑے اعلانات سننے میں آرہے ہیں
اب دیکھنا یہ ہے کہ اس آخری معرکے کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ کیا کلمۂ حق و جماعت کی پچھلی فتح مندیاں
صرف اس لیے تھیں کہ بہت زیادہ سامان اس کے حریفوں نے نہیں کیا تھا اور اب زیادہ
سامان کر کے اس کو شکست دے دی جائے گی؟ یہ سچ ہے کہ صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ نے
پچھلے اجلاس ایسوسی ایشن کی شرکت کے بعد ہی مجھ کو اپنے صوبے میں داخل ہونے سے روک
دیا ہے۔ اور اس لیے اس جلسہ میں شریک نہیں ہو سکتا۔ لیکن غالباً وہ خدا کو لکھنؤ میں آنے سے
نہیں روک سکتی اور اس کے آنے اور نمودار ہونے کی راہیں ہمیشہ ایسی رہی ہیں۔ جن کا انسانوں
کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ فاتٰھم اللہ من حیث لم یحتسبوا۔

یہ وہی حق و باطل کا مقابلہ ہے۔ جو برسوں سے ہو رہا ہے۔ یہ وہی اشخاص اور جماعت
کے وہ ہند کی معرکہ آرائی ہے۔ جس کا میدان عرصہ سے گرم ہے۔ وہی اصلاح اور افساد کی قوت
وضعف کا فیصلہ ہے جو اگرچہ اول روز ہی ہو چکا ہے۔ مگر ایک آخری فیصلہ غالباً ابھی باقی ہے

پس قریب ہے کہ حق ظاہر ہو اور کچھ دیر نہیں کہ جس کلمہ کے ساتھ اللہ کی مشیت و حکمت شامل ہے۔ وہ اپنی آخری فتح مندی کا اعلان عام کرے۔

اعملوا علیٰ مکانتکم انا عاملون
وانتظروا انا منتظرون
وما ربک بغافل عما تعملون

اے لوگو! تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ، ہم اپنی جگہ کام کر رہے ہیں۔ پھر نتیجہ کا انتظار کرو ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں۔ اور تمہارا پروردگار ان کاموں سے غافل نہیں جن میں تم لگے ہوئے ہو۔

دلائل و مباحث

ہمارا ارادہ تھا کہ اس نمبر کا ایک مضمون ان تمام دلائل و مباحث کے متعلق بھی لکھیں گے جو اس وقت تک مسلم یونیورسٹی کے بلا انتظار کے لینے کے لئے شائع کیے گئے ہیں۔ چنانچہ اس غرض سے ہم نے ایک پورے فارم کی جگہ خالی رکھی اور تمام کاغذات و رسائل جمع کر دیئے جو اس وقت تک شائع کیے جا چکے ہیں۔

لیکن اب کہ لکھنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور ان تمام مضامین و رسائل پر نظر ڈالی ہے جو ابتدا سے لے کر اس وقت تک شائع کیے گئے ہیں۔ علی الخصوص وہ تحریریں جو گذشتہ اجلاس ایسوسی ایشن کے موقعہ پر شائع کی گئیں۔ نیز وہ بعض رسائل جو پچھلے دو چار ہفتوں کے اندر نکلے ہیں۔ تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کس چیز کو دلیل و حجت کے لفظ سے موسوم کریں۔ اور اس تمام ذخیرہ کا اثنا ... کی کس سطر کو قابل بحث و مذاکرہ قرار دیں۔ اسی تمام ذخیرہ میں ایک دلیل بھی ایسی نہیں ملتی جو ثابت کر سکے کہ بحالت موجودہ (جب کہ گورنمنٹ آف انڈیا اور گورنمنٹ انگلستان نام نہاد قومی یونیورسٹیوں کے متعلق ایک انقطاعی مقام اختیار کر چکی ہے) چند دنوں کے مزید انتظار ضوابط دیونیورسٹی کی ترتیب، قوانین متعلقہ کار کی نفاذی تشکیل، اور

در منتہیٰ حافظہ کے معاملہ میں کونسا نقصان عائد ہوجاتا ہے۔ جس قدر مضامین و رسائل
شائع کئے گئے ہیں بلا شائبہ مبالغہ ان میں سوائے ضلالت گمراہی، اور تلبیسات و مغالطات
کے کچھ نہیں۔ مثلاً

(۱) ایک بڑی دلیل بار بار پیش کی جاتی ہے۔ گورنمنٹ کی رائے بدل جائے، اور پھر
یونیورسٹی نہ ملے۔ لیکن اس بیان میں کوئی دھوکے اور مغالطات ہیں۔ اول تو قومی یونیورسٹی کے متعلق
نہ صرف حکومت ہند بلکہ حکومت بالا بھی اپنی پالیسی صاف واضح کر چکی ہے اور ایک قوم کو دے
چکی ہے، اب اس میں تبدیلی کا خوف دلانا ایک ایسی سوفسطائیت ہے جس کو بجز علی گڑھ کے
"محققین تعلیم" کے اور کوئی اختیار نہیں کر سکتا۔ ثانیاً، ابھی ابھی جدید ممبر تعلیمات دہلی کی نسبت
میں نامہ کر چکا ہے۔ کہ ہندو یونیورسٹی کی شرائط پر مسلم یونیورسٹی ہر سال میں طیار ہے۔ آپ جب
چاہیں لے سکتے ہیں۔

(۲) دلیل نہیں مگر ایک بڑا مغالطہ یہ دیا جاتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی لے لینے کی صورت میں
علی گڑھ کالج کی آزادانہ حالت کچھ نہ کچھ بڑھ ہی جائے گی۔ گھٹ کسی طرح نہیں سکتی۔ مگر یہ بیان
اپنی خصوصیت اور نوعیت کے لحاظ سے ایک ایسا کامل ترین قسم کا جھوٹ ہے۔ جس سے زیادہ
غلط بیانی انسان کی زبان نہیں کر سکتی۔ دلیل میں یہ لوگ علی گڑھ کالج کے موجودہ قانون اور نامہ
یونیورسٹی بل کا مقابلہ کرتے ہیں۔ علی گڑھ کالج اور گورنمنٹ کے اختیارات کی اصلی بنا قانون
ٹرسٹیان کی دفعہ ۱۷ ہے۔ "لوکل گورنمنٹ اور ڈائرکٹر تعلیمات کو کالج کے اندرونی انتظامات
اور بورڈنگ ہاؤس کے انتظام اور کالج کے اسٹاف کے تقرر اور ترقی اور تبادلہ نیز معاملات
متعلق تعلیم مذہبی میں بجز اس کے جس کا ذکر دفعہ ۱۸ میں ہے مداخلت کرنے کا اختیار ہوگا۔"

دفعہ ۱۸ جس کا اس میں ذکر ہے یہ ہے "لوکل گورنمنٹ کو اختیار ہوگا کہ اس امر کی نسبت
اپنا اطمینان کرنے کی غرض سے کہ کالج کا اسٹاف کالج کے طالب علموں کی تعلیمی ضروریات کیلئے
کافی ہے ٹرسٹیوں سے وقتاً فوقتاً استفسار کرے اور اگر استفسار کے بعد گورنمنٹ کو یہ معلوم

ہو کہ کالج اسٹاف کا کوئی عہدہ دار اس کام کے قابل نہیں ہے، تو ٹرسٹیوں کو ہدایت کریگی کہ اس شخص کو اس عہدے سے علیحدہ کر دیا جائے۔"

ان دفعات سے واضح ہو گیا کہ موجودہ قوانین کی بنا پر لوکل گورنمنٹ کو صرف اس قدر اختیار حاصل ہے کہ اگر کالج کی تعلیمی ضروریات کے لیے کوئی عہدہ دار قابل نہ ہو تو ٹرسٹیوں کو ہدایت کرے کہ اس شخص کو اس عہدہ سے علیحدہ کر دیں۔

علاوہ بریں قانون ٹرسٹیاں اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ اس میں جس قدر دفعات گورنمنٹ اور عہدہ داران گورنمنٹ کے علائق سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان سب میں حسب ذیل الفاظ کے سوا اور کچھ نہیں مل سکتا۔

"ڈائرکٹر ٹرسٹیوں کو صلاح دینے کا اختیار ہوگا۔ ٹرسٹیوں کا فرض ہوگا کہ مشورہ کا لحاظ کریں، عمل نہ کرنے کی وجوہ قلمبند کریں۔ (دفعہ ۱۰، ۱۱) وزیر (یعنی لفٹنٹ گورنر) مشورہ دینے کا مجاز ہوگا۔ (دفعہ ۱۱، ۱۲) وزیر کو جائز ہے کہ اپنی رائے لکھے، کوئی تجویز پیش کرے، بورڈ آف منیجمنٹ کا فرض ہوگا کہ مشورہ پر غور کرے (دفعہ ۱۳ ضمن ۲) گورنمنٹ کو اختیار ہوگا کہ تحقیقات کرے (دفعہ ۴۹ ۲)

اس سے معلوم ہوا کہ موجودہ حالت میں قوانین کالج گورنمنٹ کے کسی علاقہ کو قانوناً اصلاح و مشورہ، استجاویز، دریافت و تحقیق اسے زیادہ تسلیم نہیں کرتے، اور پھر حسب دفعہ ۱۳۷ اپنے تمام اندرونی معاملات میں وہ آزاد ہے۔

اس کے مقابلے میں ہندو یونیورسٹی اور اس کی دفعات ہیں جن کا خلاصہ مختصر لفظوں میں کیا ہے کہ ہر بنیادی و اساسی قوت نہ صرف رد کر دینے بلکہ منظوری و عدم منظوری کا اختیار گورنمنٹ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے، اور ضوابط کی ترتیب بھی جس کے مطابق ہر شعبہ کام کرے گا، گورنمنٹ ہی کے متعلق ہے۔

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

آل انڈیا محمڈن کانفرنس اور دعوۃ اسلامی

(البلاغ نمبر ۱- ۲۱ جنوری ۱۹۱۶ء)

آواخر نومبر میں اسی عاجز نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جوائنٹ سیکرٹری کانفرنس کو رجسٹرڈ خط کے ذریعے اطلاع دی کہ وہ سالہائے گزشتہ کی طرح امسال بھی کانفرنس کے پروگرام میں تقریر کے لیے وقت رکھیں۔ اور میری تقریر کا موضوع "صراط مستقیم" ہوگا۔

اس خط کے جواب میں صاحبزادہ نے جو خط لکھا، اور اس کے جواب میں جو خط میں نے بھیجا، ان دونوں کی نقل حسب ذیل ہے۔ میں بیمار ہوں اور اس اشاعت میں اس کے متعلق اور کچھ نہیں لکھ سکتا۔ آئندہ نمبر میں انشاء اللہ لکھوں گا۔ یہ محض ایک شخصی مسئلہ نہیں ہے بلکہ کانفرنس کے اصول مباحث و مواعظ کا ایک عام سوال پیدا ہو گیا ہے۔ اور مسلمانوں کو معلوم کرنا چاہیے کہ اس احاطہ کے اندر اسلام کی دعوۃ و تعلیم کیلئے گنجائش ہے یا نہیں۔

(۱)

صاحبزادہ صاحب کا خط

میں گزشتہ پانچ ہفتوں میں والدہ صاحبہ کی علالت اور اپنے جوان مرگ چھوٹے بھائی کی علالت اور انتقال کے سبب سخت پریشانیوں میں رہا۔ اور نیز چونکہ آپ کے خط کے مضمون کے متعلق مجھ کو جناب والا آنریری سیکرٹری صاحب کانفرنس اور دیگر ممبروں سے مشورہ کرنا

تھا۔ اس لئے جواب میں دیر ہوئی۔ معاف فرمائیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ اس کانفرنس کے وجود کا مقصد اور موضوع تعلیمی تحریک کی اشاعت ان اصول کے مطابق ہے جو سر سید علیہ الرحمۃ نے قائم کی۔ اور جن پر علی گڑھ کی تحریک بنی ہے۔ پس کانفرنس کے پلیٹ فارم پر جو کچھ بھی تعلیمی تجاویز پیش ہوں۔ اور ان کے متعلق جو کچھ تقریریں ہوں ان میں اس اصلی غرض کا ملحوظ رہنا لازمی امر ہے۔ کانفرنس میں جو تعلیمی مسائل یا مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کے متعلق جو تجاویز پیش ہوں، ان سے اتفاق یا اختلاف کرنے کا ہر ایک ممبر کو حق ہے۔ لیکن کانفرنس کے وجود کا جو مقصد اور موضوع ہے اس پر کانفرنس کے پلیٹ فارم پر حملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں۔ اس قدر تمہید کے بعد اب میں آپ کو آپ کی وہ تقریر یاد دلاتا ہوں جو گذشتہ سال راولپنڈی کے اجلاس کانفرنس میں آپ نے فرمائی تھی اور جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ کانفرنس کی تعلیمی تحریک اس قسم کی ہے جیسے کہ کسی مردہ کو موم اور عنبر کے ذریعہ زندہ کرنے کی کوشش کرنا۔ اس سے مجھ کو بحث نہیں کہ آپ نے جس رائے کا اظہار کیا تھا، وہ صحیح ہے، یا کیا؟ لیکن یہ میں ضرور عرض کروں گا۔ کہ کانفرنس کے پلیٹ فارم پر اس قسم کی تقریر قطعاً ان مقاصد کے منافی ہے جن کے لیے یہ کانفرنس قائم ہے۔ سالہا سال کی کوشش کے بعد بڑی مشکلات کا سامنا کر کے راولپنڈی کا اجلاس اس غرض سے کیا گیا تھا کہ سرحد کے مسلمانوں کو تعلیم کی طرف توجہ ہو، اور شمال مغربی اضلاع میں جو اسلامی خطہ ہے اور جو جہل کی تاریکی کی وجہ سے نہایت پستی کی حالت میں ہے، اس میں تعلیم کے ذریعہ سے بیداری کے سامان پیدا ہوں۔ چنانچہ حتی الامکان مختلف تحریکوں اور لکچروں کے ذریعہ حاضرین کو تعلیمی تحریک کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ لیکن آپ نے آخری اجلاس میں جو تقریر فرمائی اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جو اثر کانفرنس کے مقاصد کی تائید میں پیدا ہوا تھا وہ بہت کچھ زائل ہو گیا۔ ایسی حالت میں سب سے اول یہ امر صاف ہو جانا ضروری ہے کہ جس تعلیمی تحریک کی اشاعت کے لیے یہ کانفرنس قائم ہے۔ اور جن اصول کے مطابق اور جن مقاصد

کے لیے سرسید علیہ الرحمتہ نے اس کی بنا قایم کی ہے. ان کو آپ ہندوستان کے مسلمانوں
کے لیے مفید اور ضروری سمجھتے ہیں یا نہیں! اور ان کو قوم میں مقبول عام کرانے کی کوشش
کرنا کانفرنس کے ممبروں کا فرض تصور کرتے ہیں یا نہیں؟ اس امر کی نسبت جواب آنے پر
جناب کے اول خط کے متعلق جواب عرض کر دیا جاوے گا۔ والسلام۔

خاکسار

آفتاب احمد



خط کا جواب

جس دن آپ کا والانامہ پہنچا، اس دن سے نزلہ و درد گلا میں مبتلا ہوں، تمام کام
معطل ہیں. آج کچھ تھوڑی سی جھٹ ملی تو سب سے پہلے جناب والا یاد آئے۔
افسوس کہ مجھے ان حوادث کی خبر نہ تھی جن کا ذکر جناب نے آغاز خط میں کیا ہے، ورنہ
تاخیر جواب کے لیے کسی طرح اظہار شکایت نہ کرتا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون.
وعظم اللہ اجورکم بمصائبکم۔
میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے اپنے خیالات صاف صاف ظاہر کر دیئے
اور ان بناوٹی اور نمائشی عبارات سے بالکل کام نہ لیا جو آج کل ایسے مواقع پر عموماً اخفاء
اصلیت کے لیے کام میں لائے جاتے ہیں. یہی شان ایک مسلمان کی تمام معاملات میں
ہونی چاہیئے. اگر ہم سب ایسا ہی کریں تو نصف اندرونی اختلافات کا خاتمہ ہو جائے۔
لیکن جناب نے اپنے خط میں (معاف فرمایئے گا) ترتیب مقدمات و طرز استدلال
کے لیے متعدد مسامحات جائز رکھی ہیں جن کی وجہ سے مجھے عرض جواب میں بڑی ہی مشکل پیش
آگئی ہے. اگر ان امور پر لکھتا ہوں تو صفحوں کے صفحے چاہیئں. مگر نہ مجھے اس کی مہلت ہے

نہ آپ کو اعتراض کرتا ہوں، تو خلط بحث آپ نے کر دیا ہے۔ وہ کسی مقصود کو صاف واضح نہیں ہونے دیتا۔

ایک چیز آپ کی اور آپ کے ہم خیال بزرگوں کی خواہش ہے اور ایک چیز کسی کام کے اصول و مقصد اور شرائط وغیرہ کا مسئلہ کچھ ضروری نہیں کہ پہلی چیز کی بنیاد ثانی الذکر پر رکھی جائے۔ آپ اگر دونوں مسئلوں کو الگ رکھتے تو بات زیادہ صاف اور روشن تھی۔

آپ نے کیسی تعجب انگیز غلطی کی ہے جب کہ خود ہی ایک مقدمہ قایم کیا ہے۔ اور قبل اس کے کہ مخاطب اسے تسلیم کرے یا اس کا مقدمہ مسلمہ ہونا ثابت ہو جائے، پوری شکل بھی قایم کر لی ہے۔ اور پھر نتیجہ بھی نکال لیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ "کانفرنس کا موضوع تعلیمی ہے"، یہ بالکل ٹھیک ہے۔ اور اس کا نام ہی اس کے لیے شاہد

گواہ عاشق صادق در آستیں باشد

لیکن اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ "ان اصولوں کے مطابق جو سر سید مرحوم نے قایم کیے"۔ گذارش ہے کہ مقدمہ کا یہ ٹکڑا کہاں سے ماخوذ ہے؟ میں اسے تسلیم نہیں کرتا کانفرنس کے مقاصد کی فہرست، دفعات دقواعد، شرائط و ضوابط عہد اولی کی مجلسیں، ارکان اساسی کی تقریریں، خود سید صاحب کی تقریر جو انھوں نے علی گڑھ کے دونوں جلسوں میں اور لکھنؤ میں کی، نیز اس کی تمام رپورٹیں، یہ تمام ذخیرہ موجود ہے۔ میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ اسے ثابت کر دکھائیں کہ خود سید صاحب مرحوم نے یہ کہاں لکھا ہے! اور کانفرنس کی تقریروں کے متعلق یہ فیصلہ امر و نہی کس نے قرار دیا ہے۔

بلا شبہ سر سید مرحوم اس کے بانی تھے۔ لیکن بانی ہونے سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ مسئلہ تعلیم کو انھوں نے ایک خاص اصول کے ماتحت کر کے کانفرنس کے حوالے کر دیا ہے اور اب اس کے پلیٹ فارم پر اس کے ایک حرف سے بھی انحراف و اختلاف جائز نہیں قرآن حکیم سے ہمارے مجتہدین و فقہا مسائل کا استخراج کیا کرتے ہیں۔ اس استخراج

واستنباط کی انہوں نے متعدد قسمیں قرار دی ہیں۔ ایک یہ کہ صاف صاف کسی آیت میں کوئی حکم ہو اس کو "صراحتہ النص" کہیں گے۔ ایک یہ کہ صاف صاف حکم نہ ہو۔ لیکن انداز طریق بیان سے "دلالت" ہوتی ہو یا اشارہ کیا گیا ہو تو اس کے لیے "دلالتہ النص" اور "اشارۃ النص" وغیرہ اصطلاحات قائم ہیں۔ آپ کے لیے یہ بھی دروازہ باز ہے صراحتہ النص کا تو اصل مطالبہ ہے لیکن خیر، دلالتہ النص ہی سہی۔ کسی نہ کسی طرح یہ واضح کر دیجیے کہ جناب کا پیش کردہ اعتقاد فلاں نص سے ماخوذ ہے۔

یا للعجب! آپ لوگ فخر کرتے ہیں اگر ایک نصرانی کانفرنس کے پلیٹ فارم پر اگر بہت سی ایسی باتیں کہہ جائے جو آپ کے عقائد و اغراض کے بالکل ضد ہوں، لیکن آپ لوگوں کا یہ اعتقاد ہے کہ کوئی مسلمان اختلاف نہیں کر سکتا؟

پھر کیا آپ کو یاد نہیں رہا کہ آپ کا یہ عقیدہ کس طرح ہمیشہ پامال کیا جا چکا ہے اور کتنی نظیریں اس کے لیے مخالف دستاویز موجود ہیں۔

کیا بمبئی کانفرنس کے پریذیڈنٹ مسٹر بدرالدین طیب جی نہیں بنائے گئے جو یکسر علی گڑھ تحریک ہی کے مخالف تھے۔ کیا انھوں نے اپنے افتتاحی ایڈریس کے اندر وہ کچھ نہ کہا جو سرسید مرحوم کے مشن اور عقاید و اصول تعلیم کے سر تا سر خلاف تھا؟ ان سے یہ شرط نہیں کرائی گئی، سرسید مرحوم پردۂ نسواں کے کس قدر اشد شدید حامی تھے اور خارجی تعلیم نسواں کے دلولوں پر کیسے غضبناک ہو جاتے تھے! حتی کہ میر ممتاز علی کے رسالہ حقوق نسواں کو پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا تھا۔ لیکن آپ کے پیشواؤں نے مسٹر طیب جی کو صدر بنایا اور انھوں نے پردہ کی علانیہ مخالفت پریذیڈنشل ایڈریس میں کی۔

پھر دوسری دہلی کانفرنس کی صدارت کے لیے سر آغا خاں لائے گئے۔ انہوں نے مسلمانوں کے تنزل کے جو اسباب اساسی بتلائے ان میں عورتوں کا پردہ بھی تھا۔ کیا یہ سرسید کے عقائد کے خلاف نہ تھا۔

اس پٹنہ کانفرنس کا صدر آپ نے جسٹس عبدالرحیم کو بنایا ہے، جو سر سید کے بہت سے بنیادی اصولوں ہی کے مخالف ہیں۔ کیا ان سے کبھی آپ نے یہ مقدمہ طے کرا لیا ہے؟ آپ کو معلوم ہے کہ وہ ایڈریس میں کیا کہیں گے؟ آپ کو معلوم نہیں مگر مجھے معلوم ہے۔

ررا اس کانفرنس کا صدر ایک مسیحی عہدہ دار (جسٹس آدم) تھا۔ اس مقدمہ کا اثر زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ سر سید مرحوم کے مذہبی تعلیم سے انحراف نہ ہو۔ لیکن ایک مسیحی شخص کے متعلق تو یہ سوال بھی پیدا ہو سکتا تھا کہ کہیں وہ نفس اسلام کے خلاف کوئی بات نہ کہہ دے۔ آپ تو اس وقت اس جگہ پر نہ تھے لیکن مرحوم محسن الملک کے کاغذات میں آج اقرار کی نقل تلاش کیجیے جو انھوں نے جسٹس موصوف سے کرایا تھا۔

پہلی لکھنؤ کانفرنس میں تو خود سر سید مرحوم نے مرحوم سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ سے یہ مقدمہ طے نہ کیا۔ حالانکہ بڑی ضرورت اس مقدمے کی اس وقت تھی۔ معلوم نہیں آپ کو وجہ واقعات معلوم ہیں یا نہیں۔

معاف فرمایئے گا آپ نے یہ ایک اصولی سوال چھیڑ دیا ہے۔ اور اس کے معنی یہ ہیں کہ آل انڈیا کانفرنس جس کو تمام مسلمانوں کی نیابت دی جاتی ہے، اپنے پلیٹ فارم کو ایک خاص مذہب سے وابستہ رکھتی ہے اور جو اس کے خلاف رائے رکھتا ہو اسے وہاں قدم رکھنے کا حق نہیں۔ یہ کانفرنس کا ایک خطرناک اقبال ہے اور ضروری ہے کہ ایک بار اس مسئلہ کو پبلک کے سامنے ٹھیک ٹھیک فیصل کرا لیا جائے۔ آج تک کسی کو بھی اس کا خیال نہیں ہوا تھا۔

۲- بہرحال یہ تو آپ کا مقدمہ ہے۔ اپنی اصلی حقیقت تو یہ بھی صحیح نہیں کہ میں نے راولپنڈی کانفرنس میں کانفرنس کے مقاصد کو سامنے رکھ کر اس کا رد کیا تھا۔ بلکہ اس کا مقصد عام طور پر مسئلہ دعوۃ و اصلاح کا بحث تھا۔ اور یہ دکھلانا مقصود تھا کہ مسلمانوں کی ہر دعوۃ کو اصولاً مذہبی ہونا چاہیے۔ اور اس کے واسطے سے تعلیم بھی پھیلانی چاہیے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے

کہ مذہب سے الگ ہو کر ایک مستقل تعلیمی دعوت قرار دی جائے، جس میں کبھی کامیابی نہیں ہو سکتی۔

نیز یہ کہ اسلام میں "تعلیم" کی کوئی علیحدہ دعوۃ نہیں ہے اس کی دعوۃ ایک ہی ہے اور اسی کے اندر سب کچھ موجود ہے۔

لیکن معاف فرمائیے گا یہ جو کچھ کیا گیا، اس کو آپ حضرات بالکل نہیں سمجھ سکتے۔ بلکہ قدیم و جدید جماعتوں میں آج کوئی گروہ ایسا موجود نہیں ہے جو اس حقیقت کا صحیح اندازہ شناس اور محرم و خبردار ہو گذشتہ صدی کے تمام مسائل اصلاح و دعوۃ میں سے آپ حضرت کو صرف سر سید مرحوم ہی کی تحریک کا نام معلوم ہے اور اس کے استغراق سے چھٹتے نہیں۔ آپ کو کیا معلوم کہ مسئلہ "تحریک جدید" و "دعوۃ تعلیم جدید" متعلق اہل اسلام انسیسواں ایک موضوع مستقل ہو گیا ہے اور گذشتہ صدی کے اندر تمام عالم اسلامی نے اس پر نظر ڈالی ہے، اور ایک وسیع لٹریچر اس کا موجود ہے۔ اس کے دیکھنے سے ایک شخص ان تمام مشارب و مذاہب و طرق و اسالیب کو معلوم کر سکتا ہے جو اس مسئلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور اسلام کی دینی تعلیمات اور مسلمانوں کے قومی خصائص و مقومات کے مطالعہ کا اس پر اضافہ کر کے حقیقت شناسی کی طرف قدم اٹھا سکتا ہے۔ میرے گذشتہ دس سال کے لیل و نہار، سفر و حضر، صحت و مرض ہر حال کے مطالعہ و انہماک کا ایک خاص موضوع یہ چیز بھی رہی ہے۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ مختصر رسائل و اخبارات و مجلات تمام عالم اسلامیہ کے سوا، خاص اسی موضوع پر کم از کم پچاس کتابیں میری نظر سے گذری ہیں۔ جن کے وجود کا بھی خبر دارانِ ہند کو علم نہیں۔ پھر اس کے ساتھ الحمد للہ میں نے اس بارے میں ایک مجتہدانہ بصیرت پائی ہے اور اسلامی تاریخ کے استقرائی نتائج نے بہتری مدد کی ہے۔ اور قرآن و سنت نے مجھے دلائل و براہین کے ساتھ بتلایا ہے کہ اس مسئلہ کی صحیح راہ اور یہ بعید راہ کیا ہے، واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔

بس اس بارے میں میرا مخاطب آپ حضرات سے نہیں ہے اور نہ ہی اس بارے میں آپ حضرات سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ موضوع دوسرا ہے۔ اور اس کی کائنات اس دنیا سے بالکل مختلف ہے۔ جس میں آپ لوگ بستے ہیں۔ موجودہ مسئلہ سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اور یہ بالکل بے سود تھا کہ آپ نے اپنی خواہش کو کانفرنس کے ایک اصول کی شکل میں پیش کر دیا۔

آپ لوگوں کا دعویٰ ہے کہ آپ سرسید مرحوم کے مشن کے داعی ہیں۔ سرسید کا بڑا کارنامہ یہ بتایا جاتا ہے کہ انھوں نے تقلید کا قلع قمع کیا۔ اور اجتہاد و رائے کا دروازہ کھولنا چاہا۔ لیکن آپ لوگ خود ہی ایک بدترین تقلید اعمی میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ اور یہ تقلید اس تقلید سے ہزار درجہ افسوسناک ہے جو مقلدین فقہ ہدایہ یا مقلدین تفسیر جلالین کی بیان کی جاتی ہے۔ تاہم میں اس بارے میں کچھ نہ کہوں گا۔ کیونکہ کہنا بے کار ہے۔ "تقلید" کا پہلا خاصہ یہ ہے کہ سوال کا جواب نہیں مل سکتا۔ ولکن لا حبذا لمن تنادی۔

(۳) بہر حال آپ نے میرے شخص خاص کے معاملے کو کانفرنس کا اصولی مسئلہ بنا کر ایک اہم بحث چھیڑ دی ہے۔ جس کو اگر صاف نہ کیا گیا تو کانفرنس کے دروازوں پر مسلمانوں کے لیے قفل چڑھا دیئے جائیں گے۔ اس کا صاف کرنا تو اب ناگزیر ہو گیا ہے لیکن ان دنیا داروں کے اندر آپ کے لیے کچھ ضروری نہیں ہے کہ ایک شخصی معاملے کو کسی اصول و موضوع کے حوالے کر کے الگ ہو جائیں۔ (۴) سردست اس مسئلہ کو یوں صاف کیا جا سکتا ہے کہ آپ مجھ سے شخصاً دریافت کر لیں کہ آئندہ کانفرنس میں کس موضوع پر تقریر کروں گا؟ پھر اس سے اندازہ کر لیں کہ یہ تقریر کیسی ہو گی۔

میں نے پہلے آپ کو لکھا تھا۔ اب بالتشریح لکھتا ہوں کہ میری تقریر کا موضوع "صراط مستقیم" ہو گا۔ اس کی تشریح، اور وہ بیانات جو قرآن حکیم نے صراط مستقیم

کے متعلق کیے ہیں۔ اس موضوع کے کسی حصہ کو نہ تو سرسید کے تعلیمی مشن سے کوئی تعلق ہے، ورنہ کچھ اس کی بحث ہے۔ یہ ایک خالص مذہبی موضوع ہے اور از سرتاپا قرآن و سنت سے متعلق۔

(۵) الحمد للہ کہ خدا نے ہندوستان کے ہر گوشے کو میری آواز کی پذیرائی کے لیے آمادہ کر دیا ہے اور ہر جگہ ہزارہا دل پیدا کر دیئے ہیں جو ہر آواز کے استقبال کے لیے مستعد ہیں۔ وما بنعمۃ ربک فحدث کوئی روک جو آپ حضرات اس کے لیے پیدا کریں سودمند نہیں ہو سکتی اور کتاب کی قوت جاذبہ کا فعل بس قوت سے ہوتا ہے اتنی ہی طاقت سے وہ نفع و اب بھی دیتی ہے، راولپنڈی میں آپ لوگوں نے میری مخالفت کر کے پبلک کو اپنے سے بدظن کرایا۔ پھر اس کے نتائج لازمی ہیں۔ علی الخصوص پونا کو تو میں آپ سے زیادہ جانتا ہوں۔ کانفرنس کا پنڈال آپ مجھ پر بند کر کے دیکھ لیں۔ میں کسی اور گوشے میں خدا اور اس کے رسول کا پیام مسلمانوں کو پہنچا سکتا ہوں، میرا ذاتی نقصان اس سے کچھ نہ ہوگا، اور اگر کوئی شخص اس حماقت میں گرفتار ہے کہ کانفرنس کا پلیٹ فارم میرے لیے ایک بہت ہی بڑی عجیب و غریب دولت ہے جس سے محروم ہو کر لٹ جاؤں گا۔ تو اس کی حماقت بہت ہی افسوسناک ہے۔ اگر آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ کانفرنس میں میری تقریر روک کر کوئی بڑی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں تو بسم اللہ اس کا بھی تجربہ ہو جائے۔ جب کہ چار پانچ سال سے بیسیوں تجربے آپ لوگ کر چکے ہیں۔ مجھے اللہ اور اس کے رسول کی ان تعلیمات کو کہنا، لکھنا، مدون کرنا ہے، جن کو میری بصیرت حق سمجھتی ہے اور میرا معاملہ اب وہاں تک پہنچ گیا ہے کہ اب لوگوں کے یہ ارادے اس کے لیے بالکل خارج از بحث ہیں۔ مولوی نذیر احمد مرحوم کا ترجمۃ القرآن آپ کے پاس شاید ہوگا۔ اس میں سورہ جن کو نکالیے اور کسی وقت فرصت ملے تو اس آیت پر غور کیجیے۔ "وانہ لما قام عبد اللہ یدعوہ کادوا یکونون علیہ لبدا۔"

کانپور کا دردناک نظارہ

زمین پیاسی ہے۔ اس کو خون چاہیئے۔ لیکن کس کا؟ مسلمانوں کا، طرابلس کی زمین کس کے خون سے سیراب ہے؟ مسلمانوں کے، مغرب اقصی کس کے خون سے رنگین ہے؟ مسلمانوں کے، ایران پر کس کی لاشیں تڑپتی ہیں؟ مسلمانوں کی، سرزمین بلقان میں کس کا خون بہتا ہے؟ مسلمانوں کا۔ ہندوستان کی زمین بھی پیاسی ہے، خون چاہتی ہے، کس کا مسلمانوں کا، آخر کار سرزمین کانپور پر خون برسا، اور ہندوستان کی خاک سیراب ہوئی۔

ہندوستان کی دیوی جوش وخروش میں ہے، اپنی قربان گاہ کے لیے نذر مانگتی ہے، کون ہے ہمت کا جوان جو اس کی خواہش پوری کرے، صوبہ متحدہ کا بادشاہ (سر جیمس مسٹن)، بالآخر بادشاہ کے آگے بڑھا اور اس نے اپنی وفادار رعایا (مسلمان) کا خون پیش کیا جو اپنی جان کے بعد اس کو سب سے زیادہ عزیز اور محبوب تھی۔

مسلم ہستی تو اب کہاں بسے گی؟ کہ تیرے لیے ہندوستان بھی امن کا گھر نہیں رہا، وہ جس کو تو سب سے بڑی اسلامی سلطنت کہتی تھی، وہ بھی تیرا خون مانگتی ہے۔ لیکن دشمنی سے نہیں محبت سے، وہ تیری محبت اور وفاداری کا امتحان لیتی ہے۔

ہمالیہ تو دنیا کا سب سے بڑا پہاڑ ہے، تو تند وتیز ہوا کو روک دیتا ہے، تو غیض وغضب کے بادل ٹھکرا کر پیچھے ہٹا دیتا ہے، کیا تو ہمارے شدائد ومصائب کا طوفان نہیں روک سکتا، کیا تو ہمارے حزن وغم کے بادل کو ٹھکرا کر پیچھے نہیں ہٹا سکتا۔

برٹش حکومت کہتی ہے کہ رعایا کے مذاہب کا احترام ہوگا، لیکن کیا وہ احترام اس سے بھی کم ہوگا جتنا ایک سڑک کے سیدھے ہونے کا۔ برٹش حکومت کہتی ہے کہ رعایا

کے خون کا احترام ہوگا لیکن کیا اس سے کبھی کم ہنتا ایک راستے کی زینت و آرائش کا۔

۳۰ اگست کی صبح انقلاب حکومت برطانیہ کی تاریخ میں۔ بہادر سپاہی جس وقت ایک ضعیف وناتواں و غیر مسلح مجمع پر گولی برسا رہے تھے، انھیں کیا خبر تھی کہ یہ گولیاں ان ناتواں انسانوں کے سینوں کو توڑ توڑ کر برطانی عدل وانصاف کو زخمی کر رہی ہیں؟ انھیں کیا معلوم تھا کہ گولی کا نشانہ اس ستون کو کمزور کر رہا ہے، جس پر حکومت برطانیہ کی عمارت قائم ہے؟ وہ مسرور ہیں کہ ہم وفاداری کی خدمت ادا کرتے ہیں۔ نادانو! تم اس سے عداوت کر رہے ہو جس کی محبت کا اظہار چاہتے ہو۔

وہ کیا عجیب منظر تھا جب کربلائے کانپور میں کئی ہزار بے دست و پا برطانی رعایا برہنہ سر، برہنہ پا، باچشم پرنم و بادل پرغم ایک سیاہ علم کے نیچے جو اسلام کی مظلومی و بے کسی کا نشان تھا۔ کئی سو معصوم بچوں کے ساتھ، چند اینٹوں اور پتھروں کا ڈھیر لگا رہی تھی اور اس کی زبان پر وہ دعا جاری تھی جو وقت تعمیر کعبہ ابراہیم و اسمٰعیل کی زبان پر جاری تھی۔

یہ پر اثر مقدس نظارہ ختم نہیں ہوا تھا کہ مسٹر ٹائلر (مجسٹریٹ کانپور) کی سپہ سالاری میں مختصر سوار اور پیدل فوج تمام اسلحہ سے مسلح نمودار ہو جاتی ہے، اور دس منٹ تک اپنی بندوقوں سے اڑا اڑا کر گولیوں کی ایک چادر ہوا میں پھیلا دیتی ہے۔ پردہ جب چاک ہو جاتا ہے میدان میں خاک و خون میں تڑپتی ہوئی لاشیں نظر آتی ہیں۔ جن میں معصوم جانیں بھی ہیں جو افسوس دم توڑ چکیں۔

گورنمنٹ پریس کا فرشتہ غیب ہم کو اطلاع دیتا ہے کہ میدان میں ۱۲ لاشیں تھیں، پھر بتاتا ہے ۱۸ تھیں، عقیدت مند دل اس کو تسلیم کرتا ہے لیکن عقل حجت طلب کو کیوں کر سمجھائیں کہ ایک تنگ میدان میں ۱۰، ۱۵ ہزار آدمیوں کا مجمع ہے۔ پولیس بے محابا دس منٹ تک بے پروائی سے ان پر گولیاں برساتی ہے، ہر ایک گولی ایک دو گز

کے فاصلے تک پھیلتی ہے اور صرف ۱۸ لاشیں ان کے سارنے سے گر پڑتی ہیں۔
مسلمان اپنی روئیں تنی کا دعویٰ کرتے ہیں، ان کو مسرور ہونا چاہیے کہ گورنمنٹ پریس
بھی ان کے اس اعجاز کو تسلیم کرتا ہے،

حکومت قانون کے ماتحت ہے، لیکن افسوس ہم زبان کے ماتحت ہیں، ہم
پر گورنمنٹ کا قانون حکومت نہیں کرتا۔ ہم پر حکام کی زبان حکومت کرتی ہے ایک ضعیف
و مزدور مجمع جس کے ہاتھ میں کوئی آلہ ضرر نہیں، جو کسی انسان کا محترم خون نہیں گراتا جو کسی
جاندار و عزت پر حملہ نہیں کرتا، صرف ایک جنبش لب سے آغشتۂ سنگ و خون ہو جاتا ہے
بے شبہ وہ قانون کی مخالفت کرتا تھا لیکن اس کی تادیب کے لیے عدالت کے
کمرے اور قید خانوں کی کوٹھڑیاں تھیں، سنگین کی نوکیں اور بندوقوں کی گولیاں نہ تھیں،
برٹش مورخ ہم کو بتا سکتا ہے کہ برسٹل اور مانچسٹر کے کتنے ہنگاموں میں آتشیں ہتھیاروں
سے کام لیا گیا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ وہ ہم کو حوالہ دے گا کہ برسٹل اور کانپور میں کتنی مسافت
ہے؟ لیکن اے معصوم مورخ! برائے خدا ہمیں بتا کہ برسٹل اور کانپور کی ذی روح مخلوق
میں کتنا فصل ہے؟

نصرانی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ عورتوں میں روح نہیں، لیکن اے
مقدس نصرانی! پیغمبر ناصرہ کے لیے بتایا گیا تیرا اعتقاد ہے کہ مسلمانوں میں روح نہیں،
ہاں روح ہے لیکن تو نے ان کو بے جان کر دیا، کیا تجھ کو شریعت کا یہ حکم یاد نہ رہا کہ تو
"خون مت کر"

سر جیمس مسٹن کی سرکاری اطلاع کہتی ہے کہ "معاملہ انہدام مسجد کے لیے مسلمانان
کانپور میں کوئی جوش نہیں صرف بیرونی مسلمانوں کو جوش ہے" واقعہ قتل عام سے پہلے بھی
یہ غلط تھا کہ اگر یہ سچ تھا تو مسلح سپاہی وقت انہدام مسجد کیوں گھیرے تھے؟ سنگینوں اور
بندوقوں کے ہیبت ناک نظاروں سے کن کن کو ڈرایا جا رہا تھا؟ اور اب تو حکومت

صوبہ متحدہ کو خود نظر آرہا ہوگا کہ لوازم تدبر و سیاست سے اس کا خزینہ حکومت کس قدر تہی تھا

سر جیمس مسٹن کی سرکاری اطلاع کی شہادت ہے کہ مسلمانان کانپور کا جوش جذبۂ اسلامیہ کی برافروختگی اور طعن و تشنیع و ملامت کا نتیجہ ہے، لیکن وہ کون تھا جس نے مسلمانوں کو کہا تھا کہ ان کی غیرت و حمیت کا جولانگاہ صرف قلم کا میدان ہے؟ شہنشاہی انگلستان کی نیم سرکاری زبان ٹائمز۔

سر جیمس مسٹن نے قصداً مسلمانوں کو چھیڑا اور ان کے اس جوش دینی اور ولولہ اسلامی کو جھوٹا کہا جو ۱۳۰۰ برس سے جھوٹا نہ ہوا تھا۔ انھوں نے ان زیر خاک انگاروں کو راکھ کا ڈھیر سمجھا جو تیرہ سو برس سے اسی طرح روشن رہے، سر جیمس مسٹن کے یقین کے لیے دلیل چاہیے تھی۔ فرزندان اسلام بڑھے اور انھوں نے مقتل عام میں جا کر جسمانی پردہ جو فرمانروائے صوبہ کے سامنے حائل تھا الٹ دیا اور دنیا کو نظر آ گیا کہ درحقیقت اس پردہ کے پیچھے سرخ انگارے تھے جو خود دوسروں کو نہ پھونک سکے پر خود کو پھونک دیا۔

سر جیمس مسٹن اب کیا چاہتے ہیں؟ کیا دعوائے سابق کے یقین کے لیے کسی اور دلیل کے طالب ہیں۔ اگر حقیقت میں ان کی طلب صادق ہے اور ان کی کوشش کامل ہے تو ہم بتاتے ہیں کہ ان آہنی زنجیروں میں بھی آگ ہے۔ جو اسیران مدافعت حق کے ہاتھوں اور گردنوں میں ہیں۔ انھیں خبردار رہنا چاہیے۔ کہ زنجیروں کی آہنی جسمانیت دوسری آہنی جسمانیت سے ٹکرا کر شعلہ نہ پیدا کرے۔

صوبہ متحدہ کا طرز حکومت اسی وقت ایک خونین منظر کا اشارہ کر رہا تھا۔ جب اس کا فرمانروا ایک طرف اسٹریچی ہال (علی گڑھ) میں اور دوسری طرف مدنی دربار (گورکھپور) میں ایک اسپیکر کی حیثیت سے نمودار ہوا تھا۔ اس نے دھمکی دی تھی کہ "بزور اس جوش کو فرو کروں گا" آخر ۳ اگست کو اس وقت جب کہ وہ بریلی میں تھا اور ایک مسلمان ریاست (رام پور) اس کا خیر مقدم کر رہی تھی اسی نے بزور اس جوش کو فرو کر دیا۔

ہمیں اس کا خوف نہیں کہ مسلمان ایک مسجد کے اعادۂ حرمت کی کوشش میں مقتول و مجروح ہوئے کہ یہ ان کی خصوصیت ملی ہے۔ ایک ہزار تین سو برس ہوئے کہ مسجد خلیل کی بقائے حرمت کے لیے سربکف ہیں، لیکن اس کا خوف ہے کہ حکومت متحدہ جن غیر قانونی گولیوں سے اپنی وفادار رعایا کو مجروح کر رہی تھی اس سے وہ خود تو مجروح نہیں ہو گئی؟۔

شہدائے کانپور کی یاد ہمارے دل میں ہر وقت تازہ رہے گی۔ ہم ان کی برسی منائیں گے۔ ہم ان کا مرثیہ پڑھیں گے۔ ہم ان کی مظلومی و بیکسی کو ہر وقت یاد رکھیں گے۔ ہم ان کے جوش حمایت دینی و مدافعت ملی کو روئیں گے۔ ہم آئندہ سے ۳ اگست کی صبح کو ۱۰ محرم کی دوپہر سمجھیں گے۔ کہ یہ ہماری مظلومیت کی پہلی قسط تھی۔

۴ اگست کی صبح کو ہز آنر لفٹننٹ گورنر متحدہ اسپیشل ٹرین سے کانپور پہنچ کر قتل گاہ تشریف لائے، جہاں انھوں نے دیکھا ہو گا کہ صف الشانی ہند اور غلط کاری سے جو گورنمنٹ کے منشاء قانون کے بالکل غیر مطابق تھی، اسی دیوار کے نیچے جہاں چند روز پہلے میتوں نے ایک معبد اسلام کی بے حرمتی کی تھی، پرستاران دین حنیف ایک ایک اینٹ کو اپنے خون کا سرخ کفن پہنا رہے تھے کہ اس کی ہر اینٹ دین توحید کی ایک سرد لاش تھی انھوں نے اپنے گرم خون کے چھینٹے دیئے کہ ان بے جان لاشوں میں حرکت پیدا ہو حرکت پیدا ہوئی۔ اور اس نے تمام ہندوستان کو لرزا دیا۔

ہندوستان لرزتا ہے، کون ہے جو اس کو تھامے؟ ہندوستان مضطرب ہے کون ہے جو اس کو تسکین دے؟ ہندوستان فریاد ہے کون ہے جو اس کی فریاد رسی کو آمادہ ہو!

مقتولین کانپور! تم پر نماز نہیں پڑھی گئی کہ تم مغفور تھے۔ ہم گنہگار تمہاری مغفرت کی کیا دعا مانگتے؟ لیکن سنا ہے کہ تم کو کفن نہ ملا، گولیوں اور بندوقوں کے قطع و برید کے بعد تمہارے جسم ہسپتال کی قینچیوں اور چھریوں کے کام آئیں گے۔ عزدہ نبی لحیان میں تمہارے

اسلام کی لاشیں فرشتوں نے اٹھائی تھیں ہم آج یقین رکھتے ہیں کہ اخفائے راز کے لیے اگر پولیس نے تمہاری لاشیں دریا میں نہیں پھینکیں اور زمین میں نہیں دفن کیں، تو یقیناً تمہاری لاشوں کو فرشتوں نے اٹھا لیا کہ رضوانِ الٰہی ان کا منتظر تھا۔

مجروحینِ کانپور! تم نے گولیاں کھائی ہیں۔ نیزوں سے تمہارے سینوں میں سوراخ کیا گیا ہے؟ تمہاری آنکھوں میں سنگینیں بھونکی گئی ہیں؟ تمہارے ایک ایک عضو کو زخموں سے چور کیا گیا ہے؟ تمہیں یاد ہوگا کہ فرات کے کنارے بھی اسلام کا ایک قافلہ اسی طرح لٹا تھا۔ جس کے بعد بنو امیہ کی تاریخ کا ورق الٹ گیا۔

معصوم بچو! اور ریاضِ اسلام کے نودمیدہ غنچو! تمہیں کس نے مرجھا دیا، مسٹر سیٹن کے الفاظِ طعن نے تمہیں بے گناہ ناآشنائے جرم دلوں کو مضطرب کر دیا، تم بڑھ کر اپنے خون سے اس الزام کی تکذیب کرو، اے طائرانِ قدس! اڑ جاؤ کہ عرش کی سبز قندیلیں تمہاری منتظر ہیں۔

اخبارات کے سیاہ حرفوں میں ہمارے لیے تنبیہ و عبرت نہ تھی قدرت نے خون کی سرخ تحریروں میں ہمیں نامۂ عبرت و دستورِ تنبیہ بھیجی۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کو پڑھا اور اس سے تنبیہ و عبرت حاصل کی۔

کانپور کا واقعہ کانپور کا نہیں رہا۔ بلکہ وہ دنیائے اسلام کا واقعہ ہے۔ مسلمانانِ عالم نے ہر گوشہ سے ہمارے پاس اپنے مصائب و آلام کی آغشتہ خون اطلاعات کا ہدیہ بھیجا تھا، ہم شرمندہ تھے کہ ہمارے پاس ان کے تحفہ کے لیے جو سامان تھا، اس میں خون کے قطرے نہ تھے۔ اب ہم شرمندہ نہیں، اے مسلمانانِ عالم! ہمارے بہے ہوئے خون کٹی ہوئی رگوں اور تڑپتی ہوئی لاشوں کا ہدیہ قبول کرو۔

قتل و غارت کا ہولناک منظر

(جنگِ عظیم)

موت اور ہلاکت کے وہ اوقات المیہ جو خون کی رگوں اور گوشت کے ریشوں کے اندر سے انسان کی جانوں کو کھینچ لیتے ہیں اور آبادیاں اجاڑ اور زندگیاں ہلاک ہو جاتی ہیں۔ وہ اورلحِ حروب و قتال جو زندگی کے لیے موت کا اور آبادی کے لیے ویرانے کا دروازہ ایسی عجلت اور ایسی آسانی سے کھول دیتی ہے گویا کسی لپٹے ہوئے تار کو کھول دیا گیا۔ وہ ہلاکت اور موت کی عظیم الشان ہنڈیاں جن پر انسان پاش تو پیں لدی ہوئی ہیں اور خلق کے خونخوار درندے سوار ہیں اور جو سمندروں میں تیرتی پھرتی ہیں اور ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتی ہیں تاکہ اپنے شئون امور کی تدبیر کریں۔ اب سب کی چھائی ہیبت اور پھیلی ہوئی وحشت کی قسم، اور ان سب کی پھیلائی ہوئی موت اور برسائی ہلاکت کی گواہی، کہ ارضِ الٰہی کا امن ڈوب گیا۔ انسانیت کی بستی اجاڑ ہو گئی۔ نیکی کا گھر لوٹ لیا گیا۔ اور دنیا مثل اس بیوہ کے ہو گئی جس کا شوہر زبردستی قتل کر دیا گیا ہو اور اس کے یتیم بچوں پر رحم نہ کیا گیا ہو۔ اب وہ اپنے کئے ہوئے سنگار پر ماتم کرے گی۔ اور اپنی پھٹی ہوئی چادر کو سر سے اتار دے گی کیونکہ اس کا حسن زخمی ہو گیا۔ کیونکہ اس کا شباب پامال کر دیا گیا اور اس لیے کہ اس کے فرزندوں نے اس پر تلوار اٹھائی اور اس لیے کہ اس کے دوستوں نے اسے کچل دیا۔ پس زندگی کی جگہ موت، عیش و سلامتی کی جگہ اضطراب، نغمہ نشاط کی جگہ شورِ ماتم، زمزمہ سنجی کی جگہ نوحہ خوانی، آبِ زندگی کی جگہ بحرِ خونین، بستیوں کی جگہ قبریں، اور زندگی کے کاروبار اور بازاروں کی چہل پہل کی جگہ موت کے وہ جنگل جن میں لاشیں سر رہیں

گی اور ہولناک سمندروں کے وہ خونی طوفان جن میں انسان کی لاشیں مچھلیاں بن کر اچھلیں گی۔ اور اے دنیا کے بڑے بڑے مغرور شہروں کے بسنے والو! کل تک تمہاری ماؤں نے تمہیں جنا تھا۔ تازندگی پر گھمنڈ اور طاقت پر مغرور ہو پر آج موت کے کھلونے ہو جنہیں بگاڑ دیا جائے گا اور ہلاکت کی مورتیں ہو جنہیں مٹا دیا جائے گا۔ اور پھر اے وہ کہ تمدن کی بہشت، علم کے مرغزار اور عیش دلشاد زندگی کے جبرت آباد اور تجربہ راز تھے۔ پر آج تمہاری ہلاکت کی خبریں پڑھی جائیں گی۔ کل تک تمہارے پاس کرہ ارضی کی مصیبتوں کا قلم تھا، پر آج تمہاری مصیبتوں کی تاریخیں مدون ہوں گی۔ تم کل تک دوسروں پہ ظلم و قہر کرتے تھے پر آج تم پر ظلم کیا جائے گا۔ تم کل تک دوسروں کے لیے آگ سلگاتے تھے، پر آج تمہارے لیے جہنم بھڑک رہی ہے۔ تم کل تک ضعیفوں اور ناتوانوں کے لیے درندے بنتے، پر آج درندوں میں خود مل گئے۔ اور بھیڑیوں نے آپس میں ایک دوسرے پر پنجہ مارا۔ تم کل تک دنیا کے لیے موت کی بجلی اور ہلاکت کی بدلی تھے، پر آج کوئی نہیں ہے جو تمہیں ہلاکت کی بارش اور بربادی کے رعد و برق سے بچا سکے۔ کل مشرق کی بربادیوں کا تم نے تماشہ دیکھا، آج وہ تمہاری ہلاکت کو دیکھ رہا ہے۔

ماتم انسانیت

انسان کی سوئی ہوئی بہیمیت دیکھتے دیکھتے پھر جاگ اٹھی ہے وہ اشرف المخلوقات کی صورت سے آدمی مگر خواہشوں میں کوبھیڑیا، محل سراؤں میں متمدن انسان مگر میدانوں میں جنگلی درندہ، اور اپنے ہاتھ پاؤں سے اشرف المخلوقات، مگر اپنی روح سے دنیا کا سب سے زیادہ خونخوار جانور ہے، اب اپنی خونریزیوں کی انتہائی شکل اور مردم خوری کے سب سے زیادہ برے وقت میں آگیا ہے۔ وہ کل تک اپنی کتابوں کے گھروں اور علم و تہذیب کے دارالعلوموں میں انسان تھا، پر آج چیتے کی کھال

اس کے چمڑے کی نرمی سے زیادہ حسین اور بھیڑیے کے پنجے اس کے دندان تبسم سے زیادہ نیک ہیں، درندوں کے بھٹ اور سانپوں کے جنگلوں میں امن و راحت ملے گی مگر اب انسانوں کی بستیاں اور اولاد آدم کی آبادیاں راحت کی سانس اور امن کے تنفس سے خالی ہوگئی ہیں، کیونکہ وہ جو خدا کی زمین پر سب سے اچھا اور سب سے بڑھ کر تھا۔ اگر سب سے برا اور سب سے کمتر ہوجائے تو جس طرح اس سے زیادہ کوئی اور نیک نہ تھا، ویسا ہی اس سے بڑھ کر اور کوئی برا بھی نہیں ہوسکتا۔

شیر خونخوار ہے مگر غیروں کے لیے، سانپ زہریلا ہے مگر دوسروں کے لیے، چیتا درندہ ہے مگر اپنے سے کمتر جانوروں کے لیے، لیکن انسان دنیا کا اعلیٰ ترین مخلوق، خود اپنے ہی ہم جنسوں کا خون بہاتا اور اپنے ابنائے نوع کے لیے درندہ خوار ہے۔

پھر اس سے بڑھ کر خسران و نقصان کیا ہوگا۔ جس میں آج دنیا مبتلا ہے وہ دنیا جس نے قوتوں کی صیقل کی، جس نے فطرت کے قوانین مستورہ کو بے نقاب کیا، جس نے عقل و ادراک کے خزانے کھلوا دیے، جس نے ارتقائے فکر و علوم مادیہ سے دنیا کو علم کا گھر اور دریافتوں اور تحقیقوں کی مملکت بنا دیا۔ جو علم و مدنیت کے انتہائے عروج سے متوالی ہوگئی جو قوتوں کے حصول کے نشہ سے بدمست ہوکر مغرورانہ جھومنے لگی ہے جس نے کہا کہ انسان کے سوا کچھ نہیں، اور جس نے اعلان کیا کہ مادہ کے اوپر کوئی نہیں، کیا آج اس کا یہ علم اعلیٰ یہ مدنیت عظمیٰ، یہ ایجادوں کا ڈھیر، یہ مخترعات کا انبار، یہ بیشمار کتابوں کی جلدیں اور یہ لاتعداد تحصیلی دماغوں کے افکار عالیہ و مادیہ، ایک لمحہ، ایک دقیقہ کے لیے بھی اس ہولناک بربادی، اس خوفناک انہدام، اس دحشت انگیز خونخواری اس خون کا سمندر بہانے والی اور لاشوں سے جنگلوں کو بھر دینے والی جنگ کو روک سکتے ہیں۔ اور نوع انسانی کو عالمگیر نقصان و ہلاکت سے بچا سکتے ہیں؟ کیا قانون کشش ثقل جس پر نئے علم کو ناز ہے۔ اس سے بچا لیگا؟ کیا قوت برقی کشف اسے رد کردیگا!

کیا بھاپ اور اسٹیم کی ایجاد کچھ سفارش کر سکے گی۔ اور انسان غمگینی سے بچا لے گی؟
آہ یہ ایجاداتِ محیر! یہ مخترعاتِ مادہشہ یہ محیر تماشا شورہ، جس پر مدنیت کو ناز اور علم کو غرہ
ہے۔ امن وسلامتی کی جگہ خود ہی ہلاکت اور بربادی کا وسیلہ، اور خون اور آگ کی افزائش
وتضاعف کا ذریعہ ہیں۔ اگر پہلے دنیا کے لیے صرف کمان کا تیر اور تلوار کی دھار تھی، تو
آج تمدن کی بدولت ایک سیکنڈ میں کئی کئی مرتبہ چھوٹنے والے ہلاکت بار گولے اور
لمحوں اور منٹوں کے اندر شہروں اور قلعوں کو مسمار کر دینے والے آہن پوش جہاز ہیں
پھر اے علم و مدنیت کے شیطان کیا تو اس لیے آیا تھا کہ خدا کی آبادی کی ویرانی کو دوگنا
اور اس کی ہلاکت کے آلات کو زیادہ مہلک اور لاعلاج بنا دے؟ اور اے انسان کی غفلت
اور اے اولادِ آدم کی نادانی! تو کب تک خدا سے لڑے گی۔ اور کب تک اس کی زمین
کے امن و راحت کو رد کرے گی؟ حالانکہ تمدن اور علم تجھے قوی بنا سکتا ہے پر نیک نہیں
بنا سکتا؟

رستخیزِ تصادم

اور دیکھو یہ کیسی آگ ہے جو بھڑک اٹھی ہے اور کس طرح تمدن کی حسین و جمیل
آبادیاں آگ اور دھوئیں کی ہولناکی کے اندر ویران ہو رہی ہیں۔

یہ دنیا کی مغرور اور فتحمند طاقتوں کی جنگ ہے، اور اتنی بڑی انسانی درندوں
کی لڑائی جتنے بڑے خونخوار اسباع و بہائم آج تک کرۂ ارض پر پیدا نہیں ہوئے، دنیا
نے سٹیٹس کے قصے سنے ہیں جس نے یروشلم کو تباہ کر دیا۔ دنیا نے بخت نصر کو دیکھا جو
بنی اسرائیل کو گرفتار کر کے بابل لے گیا۔ دنیا میں ایرانیوں کے قہر و استیلا کے افسانے
سنے گئے ہیں۔ جنہوں نے بابل کو مسمار کر دیا تھا۔ اور رومیوں کے عہدِ تسلط و عروج
کے ایسے بہت سے فاتح خونریزوں کی روایتیں محفوظ رکھی گئی ہیں، جنہوں نے خدا کی

پیدا کی ہوئی مخلوقوں کو بہت ستایا اور اس کی سرزمین پر بہت فساد کیا۔

لیکن خون بہانے کی ایسی شیطانی قوتیں، آگ برسانے کے ایسے جہنمی آلے اور موت و ہلاکت پھیلانے کی ایسی افراط شاید ابلیسیت تو کسی کو بھی نصیب نہ ہوئی زمین کی پشت پر ہمیشہ درندوں نے کھٹ بنائے اور اژدہوں نے پھنکاریں ماریں مگر نہ تو ایسی درندگی آج تک کبھی ہیں تھی جیسی موجودہ متمدن اقوام کی قوتوں کو حاصل ہے، اور نہ اب تک ایسا سانپ اور اژدہا پیدا ہوا جیسے کہ ان لڑنے والوں میں سے ہر فریق کے پاس ڈسنے، نگلنے اور چیرنے پھاڑنے کے لیے عجیب عجیب ہتھیار جمع ہیں پھر اژدہے کو دیکھو جو جنوب سے منہ کھولے بڑھ رہا ہے، اس ہاتھی کو دیکھو جس کی مستک غرور و طاقت سے جھوم رہی ہے۔ اور جس کے دانت ہلاکت کے دو نیزوں کی طرح نکلے ہوئے ہیں۔ اس بھیڑیے کو دیکھو جو مشرقی یورپ کے کھٹ سے چنگھاڑتا ہوا اٹھا ہے۔ اور اس خوفناک چیتے کو دیکھو جو بالمارک اور روس کی سرزمین میں خون اور گوشت کے لیے پلا ہے، یہ کیسے مہیب ہیں؟ یہ کیسے خوفناک آلات سے مسلح ہیں! ان سب کا باہم ایک دوسرے پر گرنا اور چیرنا پھاڑنا کرۂ ارض کا کیسا خوفناک بھونچال ہوگا؟ ایسا بھونچال جو کبھی نہیں آیا، ایسا طوفان جو کبھی نہیں اٹھا، ایسی آتش فشانی جو کبھی نہ ہوئی۔ اور خداوند کا ایسا غصہ جو اب تک کبھی بھی زمین پر نہ ہوا۔

متمدن قوموں کا غرور حد تک پہنچ چکا ہے۔ طاقتوں اور عجیب عجیب ترقیوں نے انھیں متوالا کر دیا ہے، ان کو حسب سنن الٰہیہ زمین کی حفاظت کا منصب دیا گیا، لیکن انھوں نے قوت پا کر جنگ و فساد کی راہ اختیار کی۔ اور طغیان و عصیان سے ارض الٰہی کو بھر دیا۔

پس ضرور تھا کہ غرور و طغیان کے لیے کوئی حد ہوتی۔ عجب نہیں کہ مہلت ختم ہوگئی ہو۔ اور اچنبھا نہیں اگر ارضِ الٰہی کے لیے امن کے لیے بندگان خدا کی راحت

کے لیے، اور کمزوروں کو سکھ کی نیند سلانے کے لیے ان کا خون انھیں کے ہاتھوں بہایا، اور اسی طرح عدالت الٰہی ان قوتوں کا حساب لے جو صدیوں سے تمام دنیا کے اعمال کا حساب لے رہے ہیں۔

یورپ کا تمدن، اسی کی طاقت، اسی کا جنگی اقتدار، اس کے عجیب عجیب اسلحہ، اور برباد کن ہولناکیاں، اس کے مہیب جہاز اور کئی کروڑ تک پہنچ جانیوالی متحدہ فوج، ایسی قاہر وجابر تھی کہ ان کی تنبیہ کے لیے خود انہی کے سوا اور نہیں ہو سکتا تھا۔ انھوں نے اپنے سوا ہر خوف کو پامال کیا، اور اپنے سوا اور کچھ رہنے نہ دیا۔ پس کون تھا جو ان کے مقابلے میں نکلتا، اور دنیا میں کس کا ہاتھ اتنا قوی تھا جو ان آہنی پنجوں پر پڑتا؟ وہ کہ سب سے بڑے ہو گئے تھے ان کے لیے وہ لوگ کیا کام دے سکتے تھے جو آج سب سے چھوٹے ہو گئے ہیں ان کے جہازوں کے مقابلے کے لیے ان کے جہازوں سے بڑھ کر جہاز چاہئیے تھے۔ مگر وہ کہاں تھے؟ ان کی توپوں کے لیے ان کی توپوں سے زیادہ ہلاکت بار توپیں درکار تھیں؟ مگر وہ کہاں ڈھلتیں؟

پس جب تمام زمین پر ان سے بڑھ کر اور کوئی نہ تھا جس کے اندر سے خدا کا ہاتھ ہوتا تو دیکھو کہ حکمت الٰہی نے کس طرح خود انہی کو مسلط کر دیا اور اس کی یہ تدبیر کی کہ باہمی جنگ و قتال میں مبتلا ہو گئے۔ اب ان کا ہولناک تمدن جس کو ایک ہزار سال کے اندر انھوں نے تیار کیا تھا، انھیں کی تخریب میں کام آیا۔ اور ان کی ہر ترقی اور ہر بڑائی خود انہی کے لیے وسیلۂ تعذیب ہو گئی۔ اگر ان کی توپوں سے بڑھ کر دوسروں کے پاس توپیں نہ تھیں تو انہی کی توپوں کے گولے ان کے لیے اڑنے لگے۔ اگر ان سے بڑھ کر جنگی جہاز دوسروں کے پاس نہ تھے تو وہی جہاز ان کے مقابلے کے لیے سمندر میں تیرنے لگے۔ ہر پتھر جو انھوں نے اٹھایا، خود انہی کے لیے اٹھا، اور ہر آلہ جو انھوں نے تیار کیا، خود انہی کے لیے متحرک ہوا۔ انھوں نے بڑا سامان کیا تھا مگر خدا کا سامان سب سے بڑا ہے۔

انہم یکیدون کیدًا
واکید کیدًا فمہل
الکافرین امہلہم
رویدًا (۵۶ : ۱۲)

یہ لوگ اپنا داؤ کر رہے تھے اور ہم اپنا داؤ
کھیل رہے ہیں بس منکروں کو مہلت
لینے دو زیادہ نہیں تھوڑی سی۔

٭٭٭٭٭



دعوتِ عمل

آنکھیں دیکھنے کے لئے ہیں۔ کان سننے کے لئے اور دل پہلو میں رکھا گیا ہے
تاکہ بیقرار ہو، لیکن وہ سب کچھ تمہارے لئے بیکار ہو گیا ہے جس کو آنکھیں دیکھتی ہیں اور
وہ سب آوازیں بے اثر ہو گئی ہیں جو کانوں سے سنائی دیتی ہیں، اور وہ تمام فکریں اور
عبرتیں ڈوب گئی ہیں جن سے دل تڑپتے اور روحیں بے قرار ہوتی ہیں پس جو کچھ کیا جاتا ہے
لاحاصل ہے اور جو کچھ کہا جاتا ہے بے کار ہے۔ آہ! تم غافل ہو گئے ہو، تم پر موت کا پنجہ
چل گیا ہے، تم گمراہی کے قبضہ میں آگئے، تمہارے احساس فنا ہو گئے، اور تمہارے دل
کی دانائی مٹ گئی، اگر ایسا نہ ہوتا تو جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے، وہ ایسا تھا
کہ اندھے بینا ہو جاتے، لنگڑے چلنے لگتے، گونگوں کی چیخ سے دنیا ہل جاتی اور لولوں کے
ہاتھ شیروں کے پنجوں کی طرح طاقتور ہو جاتے، آہ! تمہاری غفلت سے بڑھ کر آج تک دنیا
میں کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوئی! اور تمہاری نیند کی سنگینی کے آگے پتھروں کے دل پھوٹ
گئے، آہ تم ایسے نہ تھے۔

آہ! میں کیا کروں، اور کہاں جاؤں اور کس طرح تمہارے دلوں کے اندر اتر
جاؤں، اور یہ کس طرح ہو کہ تمہاری روحیں پلٹ جائیں اور تمہاری غفلت مر جائے، یہ
کیا ہو گیا ہے کہ پاگلوں سے بھی بدتر ہو گئے ہو اور شراب کے متوالے تم سے زیادہ عقلمند
ہیں، تم کیوں اپنے آپ کو ہلاک کر رہے ہو اور کیوں تمہاری عقلوں پر ایسا طاعون چھا گیا
ہے کہ سب کچھ کہتے اور سمجھتے ہو پر نہ تو راستبازی کی راہ تمہارے آگے کھلتی ہے اور نہ
گمراہیوں کے نقش قدم چھوڑتے ہو۔

پس میں آج سب کچھ چھوڑ کے تم سے ایک ہی آخری بات کہنی چاہتا ہوں اور

یقین کرو کہ اس کے سوا جو کچھ کہا جاتا ہے اگر وہ اس بات کے لیے نہیں کہا جاتا تو سب کچھ بیکار ہے اور اس میں تمہارے لیے کوئی برکت دامن نہیں۔ سو یاد رکھو اور ماننے کے لیے جھک جاؤ کہ تمہاری زندگی کا ہر عمل بیکار ہے، اور تمہاری فتحوں کی ہر فتح گمراہی و ضلالت ہے تمہارے لیے صرف ایک ہی راہِ نجات ہے اور بغیر اس کے کسی طرح چھٹکارا نہیں تم جب تک اس پہلی منزل سے نہ گذرو گے، اس وقت تک خدا کا قہر تم پر سے ٹھنڈا نہ ہوگا۔ اور تم کبھی مراد اور خوشحال نہ پاؤ گے۔ تمہارے سفر عمل کا پہلا قدم یہ ہے کہ توبہ کرو، اپنی قوتوں اور تمام طاقتوں کے ساتھ خدا کے آگے جھک جاؤ، اس کے آگے اس طرح گرو اور اس طرح روؤ اور اس قدر تڑپو کہ اسے تم پر پیار آجائے، اور تمہیں پہلے کی طرح پھر اپنی گود میں اٹھالے، اور سب کچھ تمہیں کو دیدے، جس طرح کہ سب کچھ تمہیں کو اس نے بخش دیا تھا۔

تم نے غفلت کو آزما لیا، تم نے نافرمانیوں کی صدیوں تک کڑواہٹ چکھ لی، تم نے گناہ اور معصیت کے پھل سے اچھی طرح اپنے دامن بھر لیے، تم نے دیکھ لیا کہ ایک خدا کی چوکھٹ سے تم نے سرکشی کی اور کس طرح ساری دنیا تم سے سرکش ہوگئی اور ایک اسی کے روٹھنے سے کس طرح تمام دنیا تم سے روٹھ گئی۔ بس مان جاؤ اور اب بھی باز آجاؤ۔ گناہوں کو آزما چکے آؤ تقویٰ و راستبازی کو بھی آزمالیں، سرکشیوں کو آزما چکے، آؤ اطاعت کا بھی مزہ دیکھ لیں، غیروں سے رشتہ جوڑ کے تجربہ کر چکے، آؤ اسی ایک سے پھر کیوں نہ جڑ جائیں جس سے کٹ کر ذلتوں اور خواریوں، ٹھوکروں اور راندگیوں کے سوا کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔

تمہارے خدا نے تمہارے ساتھ کونسی برائی کی تھی کہ تم نے اسے چھوڑ دیا، اور اسے چھوڑ کے کونسی دولت و نعمت ہے، جو تمہیں ہاتھ آگئی۔ خدا سے بڑھ کر وہ کون حسین ہے جس کے حسن نے تم کو خدا سے چھین لیا، اور اس سے بڑھ کر کس کے پاس محبت اور پیار ہے جس کی زنجیریں تمہارے پاؤں میں پڑ گئیں؟ تم غیروں کے پاس جاتے ہو تاکہ ٹھوکریں کھاؤ، پر خدا کے پاس نہیں دوڑتے تاکہ وہ تمہیں پیار کرے۔ اگر تم محبت کے بھوکے ہو تو الرحمن الرحیم سے

بڑھ کر اور کون ہے، جس کے عشق میں اسے چھوڑ رہے ہو؟ اگر تم رزق کے بھوکے ہو تو رب العالمین سے بڑھ کر اور کون ہے. جس کے خزانوں کے لالچ نے تم کو متوالا کر دیا ہے. اگر تم اپنی محنت کی مزدوری مانگتے ہو تو مالک یوم الدین سے بڑھ کر کون مل گیا ہے جو تمہیں بدلہ دے گا؟ آہ. ثم آہ۔

پھر کیا تم بالکل اسی سے بے نیاز ہو گئے اور اب تمہیں خدا کے آگے جھکنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی؟ کیا تم کبھی بیمار نہ پڑو گے جب کہ طبیب مایوسی کا پیام دے گا اور عزیز و اقربا دیکھ دیکھ نا امیدی سے روئیں گے، اور کیا اس وقت تمہیں خدا کو پکارنے اور ہر طرف سے مایوس ہو کر اسی سے راحت اور سکھ مانگنے کی ضرورت نہ ہوگی۔

اگر تم کو آنکھیں دی گئی تھیں تو اسی لیے تاکہ تم اس کو دیکھو. اگر تم کو دل دیا گیا تھا تو اسی لیے تاکہ صرف اسی کو پیار کرو. اگر تم کو آنسو دیئے گئے تھے. تو اسی لیے تاکہ صرف اسی کی یاد میں بہاؤ اور اگر تمہاری پیشانی بلند کی گئی تو اسی لیے تاکہ اسی کے آگے جھکاؤ۔ پر آہ۔ تمہاری زبانیں اس کی حمد کے زمزموں سے محروم ہو گئیں، تمہارے دل اس کی محبت کے نہ ہونے سے اجڑ گئے، تمہاری روحوں میں اس کی چاہت کی جگہ غیروں کی چاہتیں بھر گئیں۔ تمہارے قدم اس کی طرف بڑھنے سے بوجھل ہو گئے، اور تمہاری آنکھوں میں اس کے عشق کے درد و غم کے لیے ایک قطرہ اشک بھی نہ رہا. تمہاری مسجدیں تڑپ رہی ہیں کہ راستبازوں کی تڑپتی ہوئی اور مضطرب نمازیں ان کو نصیب ہوں، مگر حیوانوں اور چارپایوں کے کھڑے رہنے اور اوندھے ہو جانے کے سوا وہاں کچھ نہیں ہوتا حالانکہ تمہارے کھڑے رہنے اور اوندھے گر پڑنے کا کچھ کام نہیں، اور اگر پاؤں پر کھڑا رہنا ہی عبادت ہوتا ہے تو جنگلوں کے درختوں سے زیادہ تم کھڑے نہیں رہ سکتے۔

بہت ہو چکا. اب بھی چھوڑ دو. آہ، بہت سو چکے اب بھی چونک اٹھو. بہت گم ہو چکے اب بھی اپنے آپ کو پا لو. خدا نے تم کو وہ مہلت دی ہے جس سے بڑھ کر آج

تک زمین کی کسی مخلوق کو بھی مہلت نہ دی گئی، پھر ایسا نہ ہو کہ وہ تم سے اپنا رشتہ کاٹ لے اور تمہاری جگہ کسی اور کو اپنی چاہتوں کی شہنشاہی اور اپنی محبت کا تاج و تخت دیدے جیسا کہ اس نے ہمیشہ کیا ہے۔

اگر تم کو اپنا مال و متاع خدا سے زیادہ محبوب ہے کہ اسے نہ دوگے اور اپنی جانوں کو اس کی محبت سے زیادہ پیارا سمجھتے ہو کہ اس کے لیے دکھ میں نہ ڈالوگے، اور اگر تمہارے دلوں کی آہیں، تمہارے جگر کی ٹیسیں، اور تمہاری آنکھوں کے آنسو، اب اس کے لیے نہیں رہے بلکہ دوسروں کا مال ہو گئے ہیں تو یقین کرو کہ وہ بھی تمہارا محتاج نہیں ہے۔ اور اس کی کائنات انسانوں سے بھری پڑی ہے، وہ اگر چاہے گا تو اپنے کلمۂ حق کی خدمت کے لیے درختوں کو چلادے گا۔ پہاڑوں کو متحرک کردے گا۔ کنکروں اور خاک کے ذروں کے اندر سے صدائیں اٹھنے لگیں گی۔ پر وہ فاسق اور نافرمان انسانوں سے کبھی بھی کام نہ لے گا۔ اور اپنے کلام پاک کی عزت کو ناپاکیوں کی گندگی سے کبھی بھی آلودہ نہ ہونے دے گا۔ اور پھر تم مانو یا نہ مانو میں نے سچ سچ دیکھا کہ جب تمہارے اندر سے اس کی پکار کا جواب نہ ملا تو وہ دوسروں کو پیار و محبت کے ہاتھوں سے اشارہ کر رہا ہے۔

ترک اور یورپ

ہم کو معلوم ہے کہ مسلمانوں کی تمام حکمراں جماعتوں میں ترکوں ہی کی جماعت وہ بدقسمت جماعت ہے جس کے لئے کوئی یورپین دماغ منصف نہیں ہو سکتا۔ یورپ کا پچھلا مورخ ہو، خواہ موجودہ عہد کا، مدبر ہو گزشتہ عہد کے بدتر سے بدتر مسلمانوں کی مدح و توصیف کر سکتا ہے، جواب موجود نہیں ہیں لیکن ترکوں کی نہیں کر سکتا جن کی تلواریں پانچ صدیوں سے یورپ کے دل و جگر میں پیوست ہونے کے لیے چمکتی رہی ہیں، وہ خلافت بنو امیہ کی ایک بہتر تاریخ لکھ سکتا ہے، عباسیہ کے دور علم و تمدن کی مدحت سرائی کر سکتا ہے، صلاح الدین ایوبی تک کو ایک بت کی طرح پوج لے سکتا ہے۔ لیکن وہ ان ترکوں کے لیے کیوں کر انصاف کر سکتا ہے، جو نہ تو عرب پر قانع ہوئے، نہ ایران و عراق پر، نہ شام و فلسطین کی حکومت ان کو خوش کر سکی، نہ وسط ایشیا کی، بلکہ تمام مشرق سے بے پروا ہو کر یورپ کی طرف بڑھے، اس کے عین قلب (قسطنطنیہ) کو مسخر کر لیا، اور اس کی اندرونی آبادیوں تک میں سمندر کی موجوں کی طرح در آئے، حتیٰ کہ دار الحکومت آسٹریا کی دیواریں ان کے جولانی قدم کی ترکتازیوں سے بارہا گرتے گرتے بچ گئیں، ترکوں کا یہ وہ جرم ہے جو یورپ کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ مسلمانوں کا کوئی موجودہ حکمراں خاندان اس جرم (فتح یورپ) میں ان کا شریک نہیں ہے، اس لیے ہر حکمراں مسلمان اچھا تھا جو یورپ کی طرف متوجہ نہ ہو سکا۔ مگر ترک وحشی و خونخوار ہے، اس لیے کہ یورپ کا طلسم سطوت اس کی شمشیر بے پناہ سے ٹوٹ گیا۔ ترکوں نے پانچ صدیوں تک جس آزادی و فیاضی کے ساتھ حکومت کی ہے، اس کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہو سکتا ہے کہ چار صدیوں کی متصل حکمرانی کے بعد بھی محکوم عیسائیوں کی مذہبی و قومی عصبیت ویسی ہی زندہ و توانا رہی جیسی کسی متعصب مسیحی حکومت کے ماتحت رہ سکتی تھی۔

حتیٰ کہ وہ ترکوں کی کمزوری کے ساتھ ہی آزاد و خود مختار ہو گئے اور آج ایک حریف و مقابل کی طرح لڑ رہے ہیں، ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ کے پورے تسلط کو ابھی پورے سو سال بھی نہیں ہوئے۔ اتنے ہی عرصہ کی حکومت نے قومی عظمت و عصبیت کے جذبات ان لوگوں کے دلوں سے کھینچ لیے ہیں۔ جن کے آبا و اجداد ساٹھ ستر برس پہلے اسی سرزمین میں حکمران تھے۔ صرف یہی ایک یورپ کے طرز حکومت اور ترکوں کے طرز حکومت کا فرق واضح کر دینے کے لیے کافی ہے۔ ترکوں کے وہم و خیال میں بھی ظلم و خونخواری کی وہ ہیبت ناک صورتیں اور قومی تعصب و نفرت کی وہ وحشت ناک ہلاکیاں نہیں آسکتیں جو یورپ کے تمدن و تہذیب کا مغرور ترین انیسویں اور بیسویں صدی کے سورج کی روشنی کے اندر کر چکا ہے۔ ان دو صدیوں کے اندر جنگل کے [illegible] ے آرام کی نیند سوتے اور سانپوں کو ان کی غاروں سے باہر نہیں نکالا گیا۔ لیکن ایشیا و افریقہ میں یورپ کے ہاتھوں زمین کا ایک ٹکڑا بھی ایسا نہ بچ سکا جس کو وہاں کی بدبخت مخلوق اپنی کہہ سکے۔ اور جہاں ایک مالک و مختار کی طرح امن کی زندگی بسر کر سکے۔

خود اسی آخری جنگ میں یورپ کے ہر درندے نے دوسرے درندے کو جس طرح پھاڑا۔ اور ہر سفید بھیڑیئے نے دوسرے سفید بھیڑیئے پر جس طرح بحملہ مارا، نہ صرف ترکوں کی تاریخ میں بلکہ تمام ایشیا کی خونریزیوں کی مجموعی تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی۔ باایں ہمہ ترک خونخوار اور وحشی ہیں، اور یورپ تہذیب و تمدن اور امن و رحم کا پیغمبر ہے، بالخصوص برطانیہ کے مقدس جزیرہ میں تو جس قدر فرشتے بستے ہیں، وہ صرف انسانی آزادی کی حفاظت اور چھوٹی قوموں کی حمایت ہی کے لیے آسمان سے اتارے گئے ہیں، یہ کرۂ ارض کی تاریخ میں حق و باطل کا سب سے بڑا مقابلہ ہے، آج اس کی فتح و شکست کا اصلی فیصلہ نہیں ہو سکتا، زمین فوجوں کے بوجھ سے دبی ہوئی ہے۔ فضا ہوائی جہازوں کی قطاروں سے بھری ہوئی ہے، اس کا فیصلہ کل ہوگا۔ جب خدا کا دائمی قانون

نتائج و عواقب کی زبان میں حقیقت کا اعلان کرے گا اور مورخ کا قلم لکھے گا۔ کہ یہ طاقت اور گھمنڈ کا سب سے بڑا چیلنج ہے جو سچائی کو دیا جا سکتا ہے۔ تاہم سچائی ہی سب سے بڑی طاقت ہے اور بالآخر فیصلہ اسی کا فیصلہ ہے۔ سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل، ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا (۳۳: ۶۲)

آج ترکوں کی وحشت و تمدن کا فیصلہ علم و تحقیق کے ہاتھ میں نہیں ہے حریف حکومتوں کے ان مغرور وزرار کے قبضہ میں ہے جو میدان جنگ سے واپس آ کر اپنے ایک جنگی دشمن کی قسمت کا فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں۔ پس امید نہیں کہ ڈریپر (DRAPER) جیسے زمانہ حال کے مورخوں کی شہادت اس بارے میں سنی جائے۔ یہ امریکن مصنف اپنی مشہور کتاب۔ (HISTORY OF THE CONFLICT BRTUEE RELIGION AND SCIENCE) میں لکھتا ہے کہ انصاف و عدالت اور مذہبی بے تعصبی میں اپنے عہد کی تمام عیسائی دنیا پر ترکوں کو وہی فوقیت رہی ہے جو چھٹی صدی عیسوی میں عربوں کو تنزل یافتہ بیزنطائن پر حاصل تھی۔ ایڈورڈ کریسی نے تاریخ روم میں ترکوں کو تہذیب و تمدن اور علم ایجادات و اختراعات کے لحاظ سے پندرہویں اور سولہویں صدی کے تمام یورپ میں سب سے برتر قوم تسلیم کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسائیکلوپیڈیا کی قسم کی کتابیں لکھنے میں ترکوں ہی کی تقلید سے یورپ میں رواج ہوا۔ یورپ کی زبانوں میں سب سے پہلی انسائیکلوپیڈیا والامبرٹ (VALAMBER) نے لکھی۔ لیکن اس کو ایک ترک مصنف کلپی بے کی قاموس العلوم ہی کے مطالعہ سے رہنمائی ملی تھی۔ کمسریٹ، رسالہ رسانی اور فوجی شفاخانوں کا باقاعدہ انتظام ترکوں ہی سے یورپ نے سیکھا۔ قلعہ کی تعمیرات میں تمام یورپ ترکوں کا شاگرد رہا۔ فوجی باجا تمام یورپ نے ترکوں سے حاصل کیا۔ چیچک کے ٹیکہ کا اصلی موجد ایک ترک تھا یہ ڈریپر کریسی، منگ گرم، کلفرڈ وغیرہ مورخوں کی تحقیق ہے۔ جنہوں نے اپنے کتب خانوں میں بیٹھ کر ترکوں کے اعمال پر نظر ڈالی تھی۔ قدرتی طور پر مسٹر اسکوتھ اور مسٹر لائیڈ جارج

کی رائے اس سے مختلف ہونی چاہیئے۔ جو ابھی ابھی گیلی پول اور عمارہ میں ترکوں کی تلوار کا کاری زخم کھا کر نکلے ہیں۔ اور کتب خانوں کی جگہ نظارت خانوں کے اندر فیصلہ کرنے بیٹھے ہیں۔

خطابۂ الم

(توحید شہادت)

شمعہا بردہ ام از صدق بخاک شہدا
تا دل و دیدہ خوں نابہ فشانم دادند

برادرانِ عزیز!

آج جس حادثۂ کبریٰ اور شہادت عظمیٰ کے تذکار و درس کے لیے ہم سب یہاں جمع ہوئے ہیں، وقائع و حوادثِ اسلامیہ کا وہ عظیم الشان واقعہ ہے جو تاریخ اسلامی کی اولین صدی سے لے کر اس وقت تک اپنے عجیب و غریب تاثر ماتم و درد اور حیرت انگیز بقائے ذکر و تاثیر کے لحاظ سے نہ صرف تاریخ اسلام بلکہ تمام حوادث مخزنہ عالم میں ایک عدیم النظیر امتیاز رکھتا ہے۔ اگر وہ تمام آنسو جمع کیے جائیں جو ۶۱ ہجری سے لے کر اس وقت تک اسی واقعہ جاں سوز پر بہائے گئے ہیں اگر وہ تمام درد آہ و فغان سوزاں یکجا کیا جا سکے جو ان تیرہ صدیوں کی لاتعداد و لاتحصی اسلامی نسلوں کی صداہائے ماتم کے ساتھ بلند ہوتا رہا ہے، اگر درد و کرب کی وہ تمام چیخیں، اضطراب و الم کی وہ تمام پکاریں سوزش و تپش کی وہ تمام بیقراریاں اکھٹی کی جا سکیں جو اسی حادثۂ کبریٰ کی یاد نے ہزاروں لاکھوں انسانوں کے اندر ہمیشہ پیدا کی ہیں۔ تو عزیزانِ ماتم شعار؟ کون کہہ سکتا ہے کہ خونفشاں ہائے حسرت کا ایک نیا اٹلانٹک و اوقیانوس سطح ارض پر نہ بن جائے گا؟ درد اور فغاں کی ہزار ہا بھٹیاں بھڑک نہ اٹھیں گی؟ اور درد و الم کی چیخوں حسرت کی صداؤں تڑپ کی بے چینیوں کے ہنگامۂ خونین سے تمام عالم ایک شررزار نالہ دہکانہ بن جائیگا؟

تاہم میں جو پیغام پہنچانے کے لئے آج آیا ہوں وہ اس تذکرہ سے بالکل مختلف ہے۔ میں غم والم کی شدت وکثرت کے اعتراف کی تاریخ نہیں ہوں بلکہ اس عدیم النظیر شدت وکثرت کے لیے بھی آنسوؤں کی طلب ہوں، آہوں کی صدا ہوں اور آہ! آہ! اے صد ہزار آہ و حرماں کہ غم کے لیے بھوکا ہوں اور درد والم کے لیے یک قلم پیاس ہوں، پس آج میں ان آنکھوں کا تذکرہ نہیں کرتا جو بہت رو چکی ہیں، مجھے ان آنکھوں کا سراغ بتلاؤ جو اب بھی رونے کے لیے نم آلودہ ہیں! میں ان دلوں کی سرگزشت نہیں سناتا جو تڑپتے تڑپتے تھک چکے ہیں، میں ان دلوں کی تلاش میں نکلا ہوں جو اب بھی تہ و بالا ہونے کے لیے مضطرب ہیں! مجھے ان زبانوں سے کیا سروکار جن کو فغاں سنجی ہائے ماضی کا ادعا ہے؟ آہ میں تو ان زبانوں کے لیے پکار رہا ہوں جن کے اندر غم و ماتم کی بھٹیاں سلگ رہی ہیں اور ان کا دھواں آج بھی کائنات نشاط ناد انی کی اس تمام فضائے غفلت کو مکدر کر دے سکتا ہے۔ جس کو عیش وعشرت کے قہقہوں میں درد و عبرت کی ایک آہ بھی نصیب نہیں۔

نہ داغ تازہ می خارد، نہ زخم کہنہ می کارد
بدہ یارب دلے کیں صورت بے جان نمی خواہم

دعوت درد

ہاں یہ سچ ہے کہ رونے والے اس پر بہت روئے، ماتم کرنے والوں نے ماتم میں کمی نہ کی آہ و نالہ کی صداؤں نے ہمیشہ ہنگامہ الم کی مجلس طرازیاں کیں، اور یہ سب کچھ اب تک اتنا ہو چکا ہے جتنا آج تک شاید ہی دنیا کے کسی حادثہ غم کو نصیب ہوا ہو، تاہم تم یقین کرو کہ باایں ہمہ اس حادثہ عظیمہ کی دعوۃ اشک و حسرت اب تک ختم نہیں ہوئی تا آنکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی دعوۃ درد کے اندر جو حقیقی طلب تھی وہ اب تک لبیک

کے سچے استقبال سے محروم ہے۔ تیرہ صدیاں مع اپنے دوران محرم و عشرہ ماتم کے اس پر گذر چکی ہیں لیکن اب تک خاک کربلا کے وہ ذرات خون آشام، جن کو آج بھی اگر نچوڑا جائے تو خونِ شہادت کے متعدد قطرے اس سے ٹپک سکتے ہیں، بدستور آنسوؤں کے لیے پکار رہے ہیں، خون فشانیوں کے لیے داعی ہیں۔ آہ و فغاں کے لیے تشنہ ہیں، اضطراب والتہاب کے لیے بیقرار ہیں! اور فضاء ریگ زار کربلا کا ایک ایک گوشہ اب تک دیدہ ہائے اشک فشاں، جگرہائے سوختہ، دلہائے دونیم اور زبان ہائے ماتم سرا کے لیے اسی طرح چشم براہ ہے جس طرح ۶۱ھ کی ایک آتش خیز دوپہر میں خون کی ندیوں کی روانی تڑپتی ہوئی لاشوں کے ہنگامہ احتضار، اور ظلم و مظلومی، جرح و مجروحی، قتل و مقتولی کے ہنگامۂ الم کے اندر سے نالہ ساز طلب اور فغاں فرمائے دعوۃ تھا!

شدیم خاک ولیکن ببوئے تربت ما
تواں شناخت کزیں خاک مردمی خیزد

لیکن اگر یہ دعوۃ درد محض اس پانی کے لیے ہے جو عزیزوں کی جگہ آنکھوں سے بہے اگر یہ طلب غم محض ان صداؤں کے لیے ہے جن کا غوغا درختوں کے جھنڈ، چڑیوں کے گھونسلوں، دریاؤں کے سیران کی جگہ انسانوں کی زبانوں سے بلند ہوا۔ اگر یہ انتظار الم محض اس ماتم کے لیے ہے جو پتھروں کے ٹکرانے کی جگہ انسانی دست و سینہ کی ٹکر سے ہنگامہ ساز ہوا۔ تو اے برادرانِ غفلت شعار! و اے پشیمان خواب آلودہ! بلاشبہ سوال کو جواب، دعوۃ کو لبیک اور طلب کو "مطلوب" مل چکا۔ اگر انسان کا بچہ بھوک سے رونا اور روٹی کے لیے آنکھوں کو سرخ کر لیتا ہے، تو انسان کے بڑے بڑے گروہ کیوں نہیں آنسو بہا سکتے؟ اگر درختوں کے جھنڈ ہوا سے ہل کر چند لمحوں کے لیے دنیا کو شور و غوغا سے پر کر دے سکتے ہیں تو آدم کی اولاد اپنے آہ و بکا سے کیوں آسمان کو سر پر اٹھا سکتی؟ اگر بے جان و بے روح پتھر گر گر کر رعد و برق کا ہنگامہ پیدا کر دے

سکتاہے تو تم کو رد نے زار ادہ رکھتے ہوا اپنے دست ہائے ماتم کناں سے کیوں ایک ہنگامہ زار دہشت گرم نہیں کر سکتے؟ کیا تم کو دنیا کی ان آنکھوں کی خبر نہیں جو روتی ہیں۔ حالانکہ ان سے ایک آنسو بھی نہیں بہا؟ کیا تم نے ان زبانوں کے متعلق کچھ نہیں سنا، جو چیختی ہیں مگر انہوں نے ایک چیخ بھی نہ پائی؟ اور کیا تم نے ان جسموں کا تماشا نہیں دیکھا جو تہ و بالا ہوتے ہیں حالانکہ ان کو ایک تڑپ بھی نصیب نہ ہوئی؟ پھر کیا اسی غفلت آباد ہستی میں وہ دل بھی نہیں ہیں جو گو دل ہیں، مگر دل نہیں ہیں کیونکہ دل کی طرح نہیں سوچتے کیا وہ کان بھی نہیں ہیں جو گو سامع ہیں مگر کان نہیں ہیں۔ کیونکہ نہیں سنتے؟ اور کیا ایسی آنکھیں بھی نہیں ہیں جو گو بصیر ہیں مگر آنکھیں نہیں ہیں کیونکہ نہیں دیکھتیں؟ لهم قلوب لا يفقهون بها، ولهم اذان لا يسمعون بها، ولهم اعين لا يبصرون بها، اولئك كالانعام بل هم اضل واولئك هم الغافلون (۷: ۱۷۸)

پس اے عزیزان من!

درد و الم کی وہ پاک دعوتیں صرف اس روانی آب، تسلسل صدا، اور ہنگامہ غوغا ہی کے لیے نہیں ہوتیں جو آنسوؤں، فغانوں اور ماتموں کے نام سے ظہور میں آجاتے ہیں اور اگر ان کا یہی مقصد ہوتا تو اس کے لیے انسانوں کی کوئی خصوصیت نہ تھی۔ کتنے ہی سمندر پانی سے بھرے ہوتے ہیں۔ اور کتنے ہی جنگل شور و غوغا سے ہنگامہ زار ہیں بلکہ یہ دعوۃ، یہ پکار، یہ طلب، یہ "هل من مجيب"، فی الحقیقت ان آنسوؤں کے لیے ہے جو صرف آنکھوں ہی سے نہیں بلکہ دل سے بہیں۔ وہ ان آہوں کا دھواں مانگتی ہے جن کی لپٹیں صرف منہ ہی سے نہیں بلکہ الحاف قلب سے اٹھیں۔ وہ صرف ہاتھوں ہی کے ماتم کے لیے نہیں پکارتی بلکہ دل کے ماتم کی محض ایک صدائے حقیقت تشنہ ہے، اگر تمہارے پاس اس کے لیے آنکھوں کا آنسو نہ ہو، تو اسے کوئی شکایت نہیں،

لیکن آہ تمہاری غفلت، اگر تمہارے پہلوؤں میں کوئی زخم نہ ہو جس سے پانی کی جگہ خون بہے! اگر تمہاری زبانوں کو درد کی چیخ نہیں آتی تو کوئی مضائقہ نہیں، لیکن آہ، یہ کیا ہے کہ تمہارے دلوں کے اندر حقیقت شناسی کی ایک ٹیس، عبرت کی ایک ٹپک بصیرت کی ایک تڑپ احساس صحیح وحق کا ایک اضطراب بھی نہیں ہے؟

طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ؟
دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

اللہ اللہ سید الشہداء مظلوم کی مظلومی، اور یا للعجب غفلت و نادانی کی ظلومی اس سے بڑھ کر دنیا میں مظلومی، کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ دشمنوں اور دوستوں، دونوں نے اس پر ظلم کیا۔ دشمنوں نے اس کی شہادت کی اصل حقیقت و بصیرت سے غفلت کی۔ دشمنوں نے اس پر ظلم کیا کیونکہ اس کی مظلومی پر انہیں رونا آیا، پر ان دوستوں نے بھی ظلم کیا جو گو روئے، مگر اس کی اصلی تقلید و شرف کے لیے سچائی اور عمل کا ایک آنسو بھی نہ بہا سکے، دشمن تو دشمن تھے اس لیے انھوں نے اس کی دعوۃ حق کو مٹانا چاہا، مگر دوست، دوست ہو کر بھی اس کی دعوۃ کی پیروی نہ کر سکے۔ وتراهم ينظرون اليك وهم لا يبصرون (۵۶ : ۸۵)

پس سچا ماتم وہی ہے جو صرف ہاتھ ہی نہیں بلکہ دل کا ماتم ہو اور دعوۃ درد کا اصل جواب وہی ہے جو عبرت و بصیرت کی زبان سے نکلے۔ تمہاری آنکھیں اس حادثہ پر بہت رو چکی ہیں مگر اب تک تمہارے دل کا رونا باقی ہے۔ اگر رونا ہے تو اپنے دل کو رلاؤ ورنہ صرف آنکھوں کی اس روانی کو لے کر کیا کیجیے جس میں دل کی اشک افشانی کا کوئی حصہ نہیں ہے حالانکہ انسان کی ساری کائنات حیات صرف دل ہی کی زندگی سے ہے۔
فانها لا تعمى الابصار ولكن تعمى القلوب التي في الصدور۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے ٭ کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

راہ اخبار نویسی اور دعوت تبلیغ

بلاشبہ اگر تم نے اخبار نکالا ہے اور پریس قائم کیا ہے تو چاہیئے کہ سب کچھ اسی طرح کرو جس طرح اس راہ میں کیا جاتا ہے اور جس طرح کرنا چاہیئے۔ پھر تمہاری ہمت کے آگے ہندوستان کے اخبار نویس طبقہ کی قرار دادہ اصول عمل کی راہ بھی ہے۔ اور ترقی یافتہ ممالک کی حقیقی اخبار نویسی بھی۔ تم اپنے اندر اس اخلاقی اور تجارتی کیریکٹر کو بھی پیدا کر سکتے ہو جو اب تک ہندوستانی پریس نے پیش کیا ہے اور اسی تجارتی اولعزمی اور اقتصادی بلند ہمتی کے لیے بھی اپنے تئیں طیار کر سکتے ہو جو ترقی یافتہ ممالک کے پریسوں میں پائی جاتی ہے۔

تم چاہو تو "ہندوستانی اخبار نویسی" کی اس دکاندارانہ زندگی کو سیکھ سکتے ہو جو... "دوکانداری" کی قسم میں بھی سب سے ادنیٰ درجہ کی "دکانداری" ہے اور جس کے لیے ضروری ہے کہ تم ایک ایک پیسہ کے لیے رو دو، ایک ایک دھیلے کے لیے ماتم کرو، ایک ایک کوڑی کے لیے اپنے دماغ و قلم کی بہتر سے بہتر قوت کو یکسر وقف کر دو، شخصی محاسن و فضائل کا معیار صرف اپنے اخبار کی خریداری کو قرار دو، جو خریدے اسے فرشتہ سمجھو جو بدبخت نہ خریدے اسے شیطان بتلاؤ۔ بلا طلب ہر خوش پوش کے نام اخبار جاری کر دو اور سال کے آخر میں وی پی بھیج دو، اگر اس نے وی پی واپس کر دیا تو ٹکٹ کے ان پیسوں کو بھی اس کے حساب میں داخل کر دو جو واپسی کی وجہ سے ضائع ہوئے۔ اور پھر جن جن وسائل کو عمل میں لا سکو اس "شریفانہ بل" کی وصولی کے لیے اختیار کر دو حتیٰ کہ وہ بدبخت اپنی زندگی سے عاجز آ جائے اور اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لے کہ براعظم ہند میں زندہ رہنے کی ضروری شرائط میں ایک بڑی شرط کسی "اخبار نویس" کے وی پی

کو واپس نہ کرنا بھی ہے۔

غرضیکہ وہ مشکوک و منقوش وجود اعظم و اکرم جس کا ایمان نسکن نام "پیسہ" ہے بہر حال حاصل کرنا چاہیئے اور بہ حیثیت ایک "قومی اخبار نویس" ہونے کے اس کے حاصل کرنے کی ہر ممکن شکل تمہارے لیے جائز و حلال ہے۔

اگر اس تقلید زار ہند میں نئے ارادوں اور مجتہدانہ عزائم کا وجود نا ممکن نہیں ہے تو اسی طرح دوسری راہ کبھی تجارت اور دکانداری کی مگر شریفانہ و اولالعزمانہ تجارت کی تمہارے آگے باز ہے اور تم یورپ کے اخبار نویس طبقہ اور فن صحافت (جرنلزم) کے نمونوں کو اپنے سامنے رکھ سکتے ہو۔ اس لیے تمہارے لیے ایک عمدہ تجارتی کام مہیا ہو سکتا ہے جو قوم و ملک کے لیے بھی مفید و ضروری ہے اور تم ایک تاجر کی طرح خود بھی نفع اٹھا کر بہتر و احسن متاع اخوان ملت کو دے سکتے ہو۔ مگر اس کے لیے ضروری ہوگا کہ پہلے ... "ہندوستانی فن صحافت" کے اثرات دنائت اور جرائیم سفاہت سے اپنے تئیں یکقلم صاف و پاک کر لو۔ اپنے اندر بلند نظری مگر ایک تاجر کی طرح بلند نظری پیدا کرو اور وسیع سرمایے اور تجارت کے عزائم صابرہ و متحملہ کے ساتھ سفر شروع کرو۔ اس میں تمہاری مثال ایک عقلمند و تجربہ کار کاشتکار کی سی ہوگی جو قیمتی سے قیمتی بیج بھی نہایت فیاضی کے ساتھ زمین میں پھینک دیتا ہے اور ذرا بھی ہاتھ نہیں روکتا۔ تاہم یہ اس کی بے دریغ بخششیں اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ اپنا سرمایہ زمین کو بخش دیتا ہے، بلکہ اس لیے کہ آج ایک خشک دانہ دے کر کل کو اس کے معاوضہ میں ایک ہزار تر و تازہ خوشے لینا چاہتا ہے۔

دعوت و تبلیغ

لیکن "دعوۃ و تبلیغ" کی راہ نہ صرف اخبار نویسی کی راہ سے دکیونکہ یہ تو ایک شاخ ہے، بلکہ نفس تجارت اور افتادہ و سود و زیاں کی راہ سے بالکل مختلف ہے اور اس

عالم کے جس طرح مؤثرات دوسرے ہیں، اسی طرح احکام بھی دوسرے ہیں:-

مرد ایں راہ را نشانے دیگر است

تجارت کی پہلی بنیاد مسئلہ "عوض و بدل" ہے یعنی جو کچھ دیا جائے اس سے بہتر اس کے معاوضے میں لیا جائے، اور دینا صرف اس لئے چاہیے تاکہ اس کے معاوضے میں لیا بھی جائے، لیکن یہی وہ اولین مقام ہے جہاں آکر "دعوۃ" اور "تجارت" میں محض اختلاف مسلک ہی نہیں بلکہ تباین و تضاد کلی پیدا ہو جاتا ہے اور دونوں حقیقتیں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتیں۔ راہ "دعوۃ" کی پہلی بنیاد وہ چیز ہے جو بالکل اس کا عکس و تضاد ہے جو تجارت کے مذہب کا پہلا رکن تھا۔ تجارت نے اپنے مذہب "عوض و بدل" کے عقیدے پر قائم کیا ہے اور "دعوۃ" کے مذہب کا پہلا عقیدہ ایثار و قربانی ہے، پھر کہاں "عوض" کی تلاش اور کہاں "قربانی" کی پکار؟ کہاں اس لیے دینا کو جو کچھ ہے لٹانے کے لیے ہے، اور کہاں اس لیے خرچ کرنا کہ اگر تجارت نہ ہوں تو ماحصل بھی پیدا نہیں ہو سکتے؟ کجا دست طلب کی جستجو اور کجا دست معطی و مشتری کے لیے بیقراری؟

ایں الثریا و این الثری   و این معاویۃ من علی

کہاں نقد و متاع کی اس لیے فراہمی تاکہ خریدار پیدا ہو اور کہاں اس لیے گرد آوری تاکہ کوئی غارت گر لے؟

متاع جمع کن شاید کہ غارت گر شود پیدا

ایک "تاجر" اپنی تمام زندگی اور زندگی کی قوتوں کا مصرف صرف یہی سمجھتا ہے کہ کسی طرح اس کے "شخص خاص" کو نفع پہنچے اور اگر اس کا عمل وجود دوسروں کے لیے سود مند بھی ہوتا ہے تو کسی رحم و احسان کی بنا پر نہیں بلکہ اسی جذبۂ نفع تجارت کی بنا پر۔ وہ ہمیشہ ایسے دشمنوں کا انتظار کرتا ہے جن کے ساتھ اس کے نفع ذاتی کا کوئی

پیام ہو۔ وہ ایسے مواقع وحادث کو ڈھونڈتا رہتا ہے جن کا اثر تمام نوع انسانی اور پورا کرۂ ارضی کے لیے خواہ کتنا ہی مہلک و برباد کن ہو مگر اس کی متاع تجارتی کے لیے مفید ثابت ہو۔

لیکن ایک "داعی" کے عقائد و اعمال اس کے بالکل ضد ہوتے ہیں۔ اس کے اندر خواہ کتنی ہی خود غرضیاں چھپی ہوئی ہوں، نمائش و شہرت کے کیسے ہی جذبات تو یہ مخفی ہوں وہ کتنا ہی سخت خود پرست اور کیسا ہی شدید نفس خواہ ہو لیکن اگر دعوۃ و تبلیغ کے اوقات کا ایک لمحہ بھی اس پر گزرا ہے تو وہ اپنے کام اور زندگی کے بقاء کے لیے مجبور ہے کہ نفع تجارتی کی پرستش گاہ سے یک قلم باہر آجائے۔ اور اس کا نفس خواہ کتنا ہی ذات پرست ہو مگر اپنے اعمال کو بالکل اس سے متضاد و متبائن کر دے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو بہ حیثیت داعی کے اس کا وجود باقی نہ رہے گا۔ وہ اپنے وجود عملی کی بقاء کے لیے مجبور ہے کہ مشرب تجارت کی یکسر تکفیر (انکار شدید) کر دے۔ تاجر کی تمام قوتوں کا مصرف "نفع خاص" بقاء وہ جس قدر زیادہ سبق کو یاد کرے گا، اتنا ہی زیادہ اچھا تاجر ہو گا۔ مگر داعی کی تمام قوتوں کا مصرف "نفع عام" ہے یعنی دوسروں کو فائدہ پہنچانا۔ اور جس قدر سچائی، جس قدر خلوص، جس درجہ اذعان و یقین کے ساتھ اس درسی ایثار کو حاصل کرے گا، اتنا ہی زیادہ سچا داعی ہو گا۔ تاجر اپنے بنیادی عقیدے کی بنا پر صرف انہی چیزوں کا طالب رہتا ہے اور صرف انہی وقتوں موسموں، مواقع اور مقامات کو ڈھونڈتا ہے جو اگرچہ دوسروں کے لیے ضرر رساں ہوں پر اس کی تجارت کے لیے سود مند ہوں، ٹھیک ٹھیک اسی طرح ضرور ہے کہ "داعی" صرف انہی چیزوں کا طالب ہو اور صرف انہی وقتوں، موسموں، مواقع اور مقامات و حالات سے عشق کرے جو خواہ خود اس کی ذات اور اس کی ذات کے حوال و اطراف کے لیے کتنا ہی دکھ اور موت رکھتے ہوں لیکن دوسروں کیلئے ان میں راحت، سکھ اور زندگی ہو،

من و دل گرفنا شدیم، چہ باک
غرض اندر میاں سلامت اوست

موجودہ مسلمانوں کی حالت

عزیزانِ ملت! اس طول وطویل صحبت میں جو کچھ بیان کیا گیا، اس میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو میری زبان پر نئی ہو۔ یہ تمام وہی افسانہ کہنہ ہے جو پچھلے دس سال سے دہراتا آرہا ہوں اور اگر "الہلال" و "البلاغ" کی پیہم صدائیں تمہارے حافظہ میں فراموش نہیں ہوگئی ہیں۔ تو تم اس کی تصدیق کردگے تمہارے رہبروں اور پیشواؤں کی رائیں اور صدائیں کتنی ہی مضطرب و متزلزل رہی ہوں، لیکن میری طرف دیکھو! میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو دس سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کررہا اور صرف ایک ہی بات کی جانب تڑپ تڑپ کر بلا رہا اور لوٹ لوٹ کر پکار رہا ہوں۔ ولکن لا تحبون الناصحین (۷:۷۸) افسوس! کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے تم نمائش کے پجاری، شور و ہنگامہ کے بندے، اور وقتی جذبات و انفجار ہیجان کی مخلوق ہو۔ تم میں نہ امتیاز ہے نہ نظر۔ نہ تم جانتے ہو نہ پہچانتے ہو تم جس قدر تیز دوڑ کر آتے ہو اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی کرجاتے ہو، تمہاری اطاعت جس قدر سہل ہے اور تمہاری ارادت جتنی سستی، اتنا ہی تمہارا انحراف آسان ہے اور اسی نسبت سے تمہاری مخالفت بھی ارزاں ہے بس، نہ تو تمہاری تحسین کی کوئی قیمت، نہ تمہاری توہین کا کوئی وزن۔ نہ تمہارے پاس دماغ ہے نہ دل۔ وساوس ہیں جن کو تم افکار سمجھتے ہو، خطرات ہیں جن کو تم عزائم کہتے ہو۔ خدارا بتلاؤ! میں تمہارے ساتھ کیا کروں؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ آج جن باتوں کے لیے تم رو رہے ہو، یہ وہی باتیں ہیں جو ایک زمانے میں میری زبان سے فریاد کا اضطراب اور طلب کی چیخ بن کر نکلتی تھیں مگر تمہارے سینے کے اندر پتھر کا ایک ٹکڑہ ہے اس سے ٹکرا کر واپس آجاتی

تھیں۔ اور تم یک قلم انکار و اعراض میں فرو تھے؟

تم نے ہمیشہ اعراض کیا۔ تم نے اعراض ہی نہیں کیا۔ بلکہ جعلوا اصابعھم فی اذانھم، واستغشوا ثیابھم، واصروا واستکبروا استکبارا (۷۱:۷)

کی ساری سنتیں غفلت و انکار کی تازہ کردیں۔ میں نے تم میں سے ہر گروہ کو ٹٹولا۔ میں نے دلوں اور روحوں کا ایک ایک گوشہ چھان مارا۔ جب کبھی کوئی بھیڑ دیکھی فریاد کی، جب کبھی انسانوں کو دیکھا اپنی طرف بلایا۔ لکن فلم یزدھم دعائی الا فرارا (۷۱:۶)

بہت کم روحیں ایسی نکلیں جن کو حقیقت کا فہم ہو، اور بہت کم دل ایسے ملے جو طلب و عشق سے معمور ہوں۔ یہاں۔ یہاں تک کہ میں تمہاری آبادیوں سے الگ ہو کر رانچی کے گوشۂ قید و بند میں چلا گیا، اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں کبھی میری صبحیں اور میری شامیں کن فکروں اور کاموں میں بسر ہوتی رہیں۔ اب میں تم میں واپس آ گیا ہوں۔ لیکن تمہاری بھیڑوں اور غولوں میں سچی جستجو کا چہرہ اسی طرح مفقود ہے جیسا کہ ہمیشہ سے مفقود رہا ہے۔ اب تک حقیقت شناسی کی کوئی گہرائی تم میں نظر نہیں آتی۔ تم مجھے بلاتے ہو کہ استقبال سے بھرے ہوئے اسٹیشنوں پر آتارو، اور ایسے پر جوش انسانوں کے نعرے سناؤ جن کے ہاتھوں میں فتحمند فوجوں کی طرح جھنڈیاں ہوں، اور پھر اتنے انسان میری گاڑی کے چاروں طرف اکٹھے کر دو کہ ان کے ہجوم میں دو چار آدمیوں کا خون ہو جائے۔ مگر آہ! میں تمہاری ان بھیڑوں کو لے کر کیا کروں جب تمہارے دلوں میں سناٹا چھایا ہوا ہے، اور تمہارے اس جوشِ استقبال سے مجھے کیا خوشی ہو جب تمہاری روحیں موت کی افسردگی سے مرجھائی ہوئی ہیں۔ افسوس تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا ہو۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔

من بہر جمعیتے نالاں شدم ؎ جفت خوش حالاں و بد حالاں شدم

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من ⁂ وز درونِ من نجست اسرارِ من
سرِ من از نالۂ من دور نیست ⁂ لیک کس را گوش آں منظور نیست

میری راہوں میں نہ کبھی تبدیلی ہوئی، نہ میرے سفر میں کبھی یمین و یسار کا تذبذب پیش آیا ہے۔ تبدیلیاں فکروں میں ہو سکتی ہیں، قیاسوں میں ہو سکتی ہیں، پولیٹیکل حکمت عملیوں میں ہو سکتی ہیں، انسانی تقلید اس کا سرچشمہ ہے اور انسانوں اور قوموں کا اتباع اس کا منبع لیکن ان عقاید میں کچھ تبدیلی نہیں ہو سکتی جو وحی و تنزیل کی اٹل اور دائمی ہدایتوں سے ماخوذ ہیں۔ الحمدللہ کہ میں جو کچھ کہتا اور کرتا رہا وہ میرے عقائد و معلومات تھے، تمہارے بڑوں کی طرح آرا و ظنون و قیاسات نہ تھے۔ وان الظن لا یغنی من الحق شیئا (۲:۵۱)
اس وقت تم میں سے اکثروں نے اعراض کیا، بہتوں نے استہزا کیا، کتنوں ہی نے کہہ دیا کہ یہ تو ایک طرح کی مذہبی بناوٹ اور مافوق الفطرت دعووں کا اعلان ہے: یرید ان یتفضل علینا۔ بعضوں نے تو فیصلہ ہی کر دیا کہ یہ صرف فصاحت و بلاغت کی ساحری اور ایک طرح کی ادیبانہ افسون گری ہے۔ اکتتبھا فھی تملی علینا بکرۃ واصیلا۔ (۲۵: ۲) لیکن دیکھو بالآخر رفتہ رفتہ سب نے اپنی جگہیں چھوڑ دیں، سب اسی راہ پر چل پڑے، بہتوں نے دانستہ، اور بہتوں نے نادانستہ، مگر راہ سب نے وہی اختیار کی۔

آج تم سب اسی "مافوق الفطرت دعووں" اور ساحرانہ "فصاحت طرازیوں" کو اپنا اصل الاصول بنائے ہوئے ہو اور "قیام شریعت"، اور "تقدیم و اتباع شریعت" اور "حفظ و دفاع ملت" کے ناموں سے موسوم کرتے ہو۔ پس جب کہ یہ پہلا تجربہ و مشاہدہ تمہارے سامنے ہے، تو آج میں اعلان کرتا ہوں کہ دوسرے تجربہ کا وقت آ گیا۔ راہ عمل کے لیے تمہارا رخ وہ ہے جس کی طرف تم دوڑ رہے ہو اور میری راہ وہ ہے جس کی طرف پچھلے صفحوں میں بلا چکا ہوں، تم بارش کے وجود سے انکار تو نہیں کرتے، مگر منتظر

رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے تو اقرار کریں۔ لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بو سونگھ لینے کا عادی ہوں، اور صرف بادلوں ہی کو دیکھ لینا میرے علم کے لیے کافی ہوتا ہے۔ پس اگر پچھلا تجربہ بس کرتا ہے۔ تو اس سے عبرت پکڑو۔ اور اگر ابھی اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو۔

فستذکرون ما اقول لکم، وافوض امری الی اللہ ان اللہ
بصیر بالعباد (۴۰: ۴۴)



مذہب کی دکان علمائے دنیا پرست

مذہب کے دکانداروں نے جہل و تقلید اور تعصب و ہوا پرستی کا نام مذہب رکھا ہے، اور روشن خیال، تحقیق جدید کے عقل فروشوں نے الحاد و بے قیدی کے حکمت و اجتہاد کے لباس فریب سے سنوارا ہے، نہ مدرسہ میں علم ہے، نہ محراب مسجد میں اخلاص اور نہ میکدے میں رندانِ بے ریا۔ ارباب صدق و صفا ان سب سے الگ ہیں اور سب سے پناہ مانگتے ہیں۔ ان کی راہ دوسری ہے۔

ہم کعبہ و ہم بت کدہ سنگِ رہ ما بود
رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم

علمائے دنیا پرست

سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے۔ لیکن علماء دنیا پرست کبھی ایک جا اکٹھے نہیں ہو سکتے، کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور ان کے پنجے تیز اور دانت زہر آلود ہو گئے۔ یہی حال ان سگانِ دنیا کا ہے ساری باتوں میں متفق ہو سکتے ہیں، لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی ہو، وہاں پہنچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ ان کا سرمایہ نازِ علم حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباع سبل متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے، بلکہ تکبیر علم بدل و خلاف ہے، نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر دیتی اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات کو اور زیادہ تیز تر کرتی رہتی ہے۔ فساق و فجار خرابات میں کہانیوں کی طرح ایک

دوسرے کا جام صحت پیتے ہیں۔ اور چور اور ڈاکو مل جل کر رہزنی کرتے ہیں مگر یہ گردہ خدا کی مسجد اور زہد و عبادت کے صومعہ و خانقاہ میں بیٹھ کر کبھی متحد و یک دل نہیں ہو سکتا اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرتا پھاڑتا اور پنجہ مارتا رہتا ہے۔ میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار و الفت کی باتیں سننے میں آجاتی ہیں۔ مگر یہاں محراب مسجد کے نیچے پیشوائی و امارت کے لیے ان میں سے ہر ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے کھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے احبار یہود سے فرمایا۔ "تم نے داؤد کے گھر کو ڈاکوؤں کا کھبٹ بنا دیا ہے"۔ ڈاکوؤں کے کھبٹ کا حال تو نہیں معلوم، لیکن ہم نے مسجدوں کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غرانے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے۔

یورپ اور اسلام کی مساوات

یورپ کہتا ہے کہ مساوات وحریت کا وہ معلم ہے۔ ہم اس کو سچ مان لیتے ہیں، لیکن پھر یہ کیا ہے جو اب تک بادشاہوں کے سروں پر نظر آتا ہے، یہ کس کی دولت ہے جو تاج شاہی کے ہیروں میں دفن کی جاتی ہے۔

وہ سربفلک عمارتیں، وہ عظیم الشان محل وایوان، وہ انسانی ترقی کے بہتر سے بہتر وسائل تعیش اور ذرائع آرام وراحت جو آج بھی اس کے بادشاہوں اور پریذیڈنٹوں کے لیے لازمی سمجھے جاتے ہیں، کہاں سے آتے ہیں اور کن کا خون ہے جن کے قطروں سے عظمت وکبریائی کی یہ چادر رنگی جاتی ہے۔

اگر یورپ نے مساوات انسانی کا راز پالیا ہے تو اب تک بادشاہ ورعیت کے حقوق وامتیازات میں یہ فرق کیوں ہے؟

یورپ کی مساوات یہ ہے کہ بادشاہ کے ہاتھ سے مطلق العنانی کی باگ چھین لے۔ مگر اسلام صرف اتنے ہی کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ وہ ان کے سروں پر سے تاج اور ان کے نیچے سے تخت بھی کھینچ کر الٹ دینا چاہتا ہے۔ کیونکہ وہ کسی انسان کو محض خلیفۂ وقت ہونے کی بنا پر یہ حق دینا جائز نہیں رکھتا کہ لاکھوں انسانوں کے سر ننگے پاؤں ہوں مگر اس کا سر ہیروں اور موتیوں سے لیپا جائے۔

مدینے کا وہ فاروق بادشاہ چٹائی پر سوتا تھا اور اس کے جسم مبارک پر داغ پڑجاتے تھے۔ اس کے جانشین عین اس وقت جب روم وعجم کے تخت الٹنے کیلئے حکم دینے والے تھے، پھٹے کمبلوں کو جسم پر رکھتے تھے اور تنوں کی جھونپڑوں کے نیچے سوتے تھے۔

ڈاکو اور سُود خوار

انسان کے ان تمام بڑے بڑے جرائم جن کو اس کی خود غرضی کا دیو اس کے اندر سے انجام دیتا ہے، اپنے سامنے لاؤ اور ایک ایک کر کے دیکھو۔ بڑے بڑے عادی مجرموں کو تم دیکھو گے کہ بار بار انسانی مظلومی اور بے کسی نے ان کی آنکھوں کو اشکبار، اور ان کے دلوں کو دونیم کر دیا ہے۔ سخت سے سخت بے رحم ڈاکو اور قاتل کی نسبت بھی تم سن سکتے ہو کہ اس نے عین اپنی بے رحمی اور قساوت کے کسی عمل کو انجام دیتے وقت ایک بڑھیا عورت کی فریاد ایک بیکس عورت کی گریہ وزاری اور ایک یتیم بچے کی مضطربانہ فغان الغیاث پر اپنی کھینچی ہوئی تلوار پھینک دی اور چند لمحوں کے لیے اس کی بھولی ہوئی انسانیت یاد آ گئی۔ تاریخ اور ملکی روایات نے ان ڈاکوؤں کے حالات قلمبند کیے ہیں جو ایک طرف تو دولت مندوں کو لوٹتے اور مال و دولت سے بھرے ہوئے قافلوں کو تاخت و تاراج کرتے تھے، دوسری طرف صدہا بیوہ عورتیں اور بیکس و مسکین خاندان تھے جن کو فیاض طبع دست کریم اور ایک دریائے بخشش بادشاہ کی طرح امداد و اعانت سے مالامال کر دیتے تھے۔ انگلستان کے قرون متوسط اور ہندوستان کے گذشتہ زمانے کے بڑے بڑے ڈاکوؤں کی نسبت ہر شخص جانتا ہے کہ انہوں نے قصبات و دیہات کی بیکس عورتوں کے لیے باقاعدہ وظائف و مشاہرے مقرر کر دیے تھے۔ اور روم کے ایک مشہور ڈاکو نے ٹیٹس سے کہا تھا، میرا مجرم ہاتھ بادشاہ کے مقدس ہاتھ سے زیادہ غریبوں اور بیکسیوں کی امداد کرتا ہے، اگرچہ وہ بادشاہ اور میں ڈاکو ہوں۔ یہی حال تقریباً انسان کے تمام بڑے بڑے جرائم کا ہے۔ اور فضیلت انسانیہ

پر بڑی سے بڑی زندگی کی تاریکی میں کبھی کبھی نہ کبھی اپنی روشنی بے نقاب کر دیتی ہے لیکن اس کے مقابلہ میں ایک سود خوار زندگی کو لاؤ، وہ چور نہیں ہے، وہ ایک ڈاکو کے نام سے حقیر و ذلیل نہیں کیا جاتا، لوگ اس سے پناہ نہیں مانگتے بلکہ اس کو ڈھونڈتے ہیں، وہ پہاڑوں کے غاروں اور جنگلوں کے گنجان گوشوں میں مجرموں کی طرح نہیں چھپتا، وہ سوسائٹی سے مردود و مطرود نہیں ہے، اس نے بادشاہ کے قانون کو توڑنے اور انسانوں کے آداب و مراسم کی حقارت کا کبھی جرم نہیں کیا۔ وہ ایک شہری ہے، جو مثل ایک شریفانہ باشندۂ شہر کے انسانوں میں رہتا ہے اور جسم اجتماعی میں عضوِ صحیح کی طرح شامل ہے، بایں ہمہ اس کے اعمال کا کیا حال ہے؟ وہ ڈاکو سے بڑھ کر آبادی کو غارت کرتا، وہ قاتل سے زیادہ انسانی حیات کو موت سے تبدیل کرتا، وہ عادی مجرم سے زیادہ سوسائٹی کو تباہ کرتا، وہ ایک درندہ سے بھی خوفناک تر خون آشام اور بھیڑیے اور جنگلی سور سے بھی بڑھ کر حیاتِ انسانی کا دشمن ہے۔ پھر ان سب سے زیادہ یہ کہ سخت سے سخت بے رحم ڈاکو کی آنکھوں سے بھی کبھی رحم کا ایک قطرۂ اشک ٹپک پڑتا ہے پر یہ خیال قطعی ہے کہ اس کی قساوت و شقاوت کبھی کبھی کسی تڑپتے ہوئے جسم اور کسی اکارت ہوتی زبان پر ایک لمحے، ایک دقیقے اور ایک ششر دقیقے کے لیے بھی ترس کھاتی ہے،

شیکسپیئر کے ایک شائیلاک کا ذکر ہے سو ہے دنیا میں اس وقت تک کتنے ہزار شائیلاک گزر چکے ہیں اور کتنے ہمارے سامنے موجود ہیں۔

ایک اہم نکتہ

اگر ایک شخص چور ہے، ڈاکو ہے، قاتل ہے، تو قانون اس کو قتل کرے گا اور انسانی آبادی اس سے پناہ مانگے گی، لیکن ایک سود خوار جو کہتا ہے کہ "انما البیع مثل الربوٰا" اس کا کیا علاج ہے؟ اس نے تجارت کی ایک دکان کھول دی ہے

اور ضرورت و احتیاج انسان کے ہوش و حواس کو معطل کر دیتی ہے۔ لیکن "شائیلاک" کے پاس تو اس کا مظلوم قرض دار خود ہی دوڑ دوڑ کر گیا تھا۔ پس فی الحقیقت قتل و غارت کسی قانون اور مذہب کے لیے اس درجہ سختی کے مستحق نہیں ہو سکتے جس قدر کہ سود اور سود خوار کی زندگی۔

پھر کیا "حرب من اللہ و رسولہ" سے اس کی تعبیر صحیح نہیں؟ اور کیا مذاہب عالم میں اسلام کی یہ سب سے بڑی خصوصیت نہیں کہ اس کے باوجود جاہلیت عرب کے اس میں غرق ہونے کے سود خواری کو سب سے بڑا جرم اور معصیت کبیرہ قرار دیا ہے۔

تجارت اور لین دین کی بے رحمیوں، اور عام بے رحمیوں میں بڑا فرق ہے، انسان کے تمام مظالم اور بے رحمیاں ایسی ہیں کہ انسانوں کے لیے کوئی دام اور کشش اپنے اندر نہیں رکھتیں، وہ از سر تا پا نفرت اور مبغوضیت ہیں۔ لوگ ان سے پناہ مانگتے ہیں۔ لیکن روپے کا لین دین ایک ایسی شے ہے کہ خواہ کیسے ہی سخت سے سخت عنوان سے ظلم ہو، لیکن چونکہ احتیاج اور ضرورت کو وقتی اور فوری طور پر دور کرنے والی ہے، اسی لیے انسان اس سے بھاگ نہیں سکتا بلکہ پناہ مانگنے کی جگہ خود اس کی طرف دوڑتا ہے وہ جانتا ہے کہ سود خوار ایک بے رحم ڈاکو اور خونخوار درندہ ہے لیکن جنگل کے ڈاکو سے نفرت کرتا اور اس شہری ڈاکو کے آگے عاجزی سے ہاتھ جوڑتا ہے۔ تاکہ وہ اسے اپنے دام ظلم میں پھنسانے کے لیے چن لے اور اس کو مجروح تیغ قساوت و بے رحمی کرنے سے انکار نہ کرے۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اور تمام ہزار ہا انسانی بے رحمیاں کسی آبادی کو اس طرح نقصان نہیں پہنچا سکتیں، جس درجہ پورے شہر میں ایک "سود خوار" کا وجود پہنچا سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس کو سب سے بڑی وعید الٰہی کا مستحق قرار دیتا ہے۔

اس کی علت اصلی

اصل یہ ہے کہ کسی خود غرضی کے عمل اور بے رحمی کے کام میں اس درجہ استمرار اور مداومت نہیں ہے جیسی کسی کاروباری بے رحمی میں۔ قاتل ایک شخص کو چند لمحوں میں قتل کر ڈالے گا، ڈاکو ایک گھنٹے کے اندر ایک قافلہ کو لوٹ لے گا لیکن سود خوار کا عمل ظلم دائمی اور انسانی عمروں، خاندانوں اور نسلوں تک جاری رہتا ہے اور جب تک ہمیشہ کے لیے اس کے تڑپنے، لوٹنے اور کراہنے کا نظارہ کا عمل اپنے اندر پیدا نہ کرے وہ سود خوار نہیں بن سکتا۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی قساوت و بے رحمی سب سے زیادہ سخت اور تمام جرائم کے عادیوں سے زیادہ مستقل و محکم ہوتی ہے۔ وہ چونکہ ہمیشہ اپنی بے رحمی کے شکاروں کی مظلومی کو دیکھتا رہتا ہے۔ اور ان کی بے قراریوں کے معاینہ کا اپنے دماغ کو عادی بناتا رہتا ہے۔ اس لیے رفتہ رفتہ اس کے تمام قوائے ملکوتیہ پر ایک عالم ممات طاری ہو جاتا ہے اور رحم و ہمدردی کے جذبات اس طرح بیکار و معطل ہو جاتے ہیں کہ قوی سے قوی محرک بھی ان کو زندہ نہیں کر سکتا۔

یہ کیا بات ہے کہ ڈاکو رحم کرتا، مگر سود خوار کی آنکھیں ہمیشہ خشک رہتی ہیں، اس کا سبب یہی ہے کہ ظلم کا استمرار اور بے رحمی کی مداومت ڈاکو کو نصیب نہیں جیسا اور جس قدر کی بے رحمی میں ایک سود خوار کی زندگی بسر ہوتی ہے۔

جہاد یا قتال

آج سے نہیں مدتوں سے ہم کو معلوم ہے کہ بعض محتسب حلقوں میں ہماری نسبت کیا خیال کیا جاتا ہے؟ ہم جانتے ہیں کہ من جملہ اور بہت سی باتوں کے ایک لفظ "جہاد" کا اعادہ و تکرار بھی ہے بہت سے لوگ ہیں جو اس لفظ کو سن کر سر سے لے کر پاؤں تک کانپ اٹھتے ہیں۔ اور "الہلال" کی سطروں پر انگلیاں رکھ کر گننا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ لفظ ہر صفحہ پر کتنی مرتبہ استعمال کیا گیا ہے۔ بیشک ہم نے آغاز جنگ طرابلس کے وقت جو تقریر کی تھی اسی میں جنگ طرابلس کو جہاد سے تعبیر کیا تھا۔ اور اس کو ایک اسلامی اور یورپ کی اصطلاح کے مطابق ایک دینی جنگ بتلایا تھا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ "الہلال" کے صفحوں پر ہم نے ہمیشہ اس جنگ کو جہاد قرار دیا۔ اور "ناموران غزوہ طرابلس" کی ایک مستقل سرخی رکھی۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ ابھی ابھی ۲۰ ر اکتوبر کی تقریر میں ہم نے علانیہ مسلمانوں کو جہاد کی دعوت دی۔ اور وہی کہا جو مسلمانوں کو ہمیشہ کہا گیا ہے کہ:

"جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ"

یہ بھی سچ ہے کہ ہم جا بجا قرآن کریم کی ان آیتوں کو جن میں جہاد کا ذکر ہے، موجودہ حالات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں اور در اصل یہی ہمارا جرم حقیقی ہے کہ یہ قرآن نامی ایک کتاب ہے جسے ہم ترک نہیں کر سکتے۔ یہ تمام صحیح اور ناقابل تاویل واقعات ہیں۔ جن کو قبل اس کے کہ اور لوگ تلاش و جستجو کے بعد مرتب کریں ہم نے خود ہی یہاں جمع کر دیا ہے۔ لیکن پھر ہم نہیں سمجھتے کہ ہم سے کیا چاہا جاتا ہے؟ ہم نے اگر جنگ طرابلس اور بلقان کو لفظ جہاد سے تعبیر کیا تو درحقیقت یہ ہمارا ایک احسان عظیم ہے کہ مسیحی دنیا کو اسلام کی رحمت سے اب

بھی محروم رکھنا نہیں چاہتے۔ اگر ہم نے کہا کہ مسلمانوں کے لیے طرابلس اور بلقان میں ایک معرکۂ جہاد گرم ہے نہ کہ قتال تو فی الحقیقت یہ کہہ کر ایک بہت بڑے خطرۂ عظیم کو یورپ کے سر سے ٹال دیا۔ جس میں عجب نہیں کہ وہ کسی وقت گرفتار ہو جاتا۔ کیونکہ اگر ہم موجودہ لڑائیوں کو جو یورپ کا سدید کروسیڈ اسلام کے مقابلہ میں جاری کیے ہوئے ہے اپنی دینی جنگ کی جگہ مسیحیت کی "مدنی جنگ" سمجھ لیں تو یورپ یاد رکھے کہ پھر ہمارا وجود یقیناً اس کے لیے ایک بے امان خطرہ ہو جائے گا۔ پھر ہمارے سامنے بھی یورپ کی جنگ مدنی کا نمونہ اتباع و پیروی کے لیے آجائے گا۔ پھر ممکن ہے کہ مسلمان بھی مقابل فریق جنگ کے سوا ہر وجود مسیحی کو ویسا ہی مستحق قتل و غارت سمجھ لیں جیسا کہ ۲۶ / اکتوبر کو جنرل کینوا نے طرابلس کی مدنی جنگ میں سمجھا تھا۔ ممکن ہے کہ ان کی تلوار بھی کسی بوڑھے مرد اور کسی کمزور عورت کو مستثنیٰ نہ کرے جس طرح شہر طرابلس میں اٹلی کے جنگ جویانِ تمدن نے کیا تھا۔ کچھ بعید نہیں کہ وہ بھی مقتول لاشوں کے اس طرح ٹکڑے ٹکڑے کریں جس طرح جنگ روم و روس میں روسی کاسکوں نے ترکی لاشوں کے ساتھ کیا تھا۔ اور کیا عجب ہے کہ اختتام جنگ کے بعد وہ بھی اپنے کسی دشمن کی لاش کو قبر سے نکال کر لٹکا دیں جس طرح سوڈان کے فاتح کو کرنا پڑا تھا۔ یہ سب کچھ ہو سکتا ہے کیونکہ مسلمانوں کے آگے ایک "مدنی جنگ" ہوگی نہ کہ دینی۔ لیکن اگر ہم نے موجودہ لڑائیوں کو قتل دینی سے تعبیر کیا اور اس کو (بزعم یورپ) ایک حرب دینی قرار دیا تو پھر معاً ہمارے ہاتھ بندھ جائیں گے، ہماری آزادی مقید ہو جائے گی اس کی خود مختاری اور بے روک آزادی قائم نہیں رہنے گی کیونکہ اس کو حکم قرآنی کی حاطت کے ماتحت ہو جانا پڑے گا جو کہتا ہے۔

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ۔

اللہ کی راہ میں صرف ان کو قتل کرو جنہوں نے تمہارے ساتھ مقابلہ کیا۔ اور اللہ زیادتی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔

پس ہمارے لیے معصیت ہو جائے گا۔ ہم اپنے خدا کی نظروں میں مغضوب ہو جائیں گے۔ اگر ان لوگوں کے سوا جو مسلمانوں کے مقابلہ میں صف آرا ہیں کسی دوسرے غیر مسلم کو اپنا مخالف سمجھیں گے اور کوئی ادنیٰ قسم کا بھی نقصان پہنچائیں گے، کیونکہ پھر ہماری تمام جنگ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ میں محدود و مقید ہو جائے گی، قرآن نے ہم کو حکم دیا ہے کہ

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ○ اِنَّمَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ قٰتَلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَاَخْرَجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ وَظٰھَرُوْا عَلٰٓی اِخْرَاجِکُمْ اَنْ تَوَلَّوْھُمْ وَمَنْ یَّتَوَلَّھُمْ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ

جن لوگوں نے تم سے دین کے لیے جنگ نہیں کی اور تم کو گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ اس سے نہیں روکتا۔ کہ تم ان کے ساتھ احسان و بھلائی کرو اور انصاف کے ساتھ پیش آؤ۔ کیونکہ اللہ عدل کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔ اللہ تم سے صرف ان لوگوں سے میل ملاپ کرنے سے روکتا ہے۔ جنہوں نے تم سے مقابلہ کیا۔ اور تم کو گھروں سے نکالا۔ تمہارے دشمنوں کی مدد کی۔ بیشک جو شخص ایسے لوگوں سے دوستی رکھیگا اسکا شمار مسلمانوں پر ظلم کرنیوالوں میں ہوگا

پہلی آیت میں نفی کی نہی کر دی گئی تھی کہ غیر محارب جماعتوں سے اگرچہ وہ محارب جماعتوں کے ہم جنس و ہم مذہب ہی ہوں، دوستی و حسن معاملت سے نہیں روکا جاتا۔ پھر اس کو بھی اظہار رافت و رحمت کے لیے کافی نہیں سمجھا اور دوسری آیت میں مکرر نہی کا حصر کیا گیا، تاکہ مطلب واضح تر اور حکم بالکل غیر مشتبہ ہو جائے۔ "انما" حصر کے لیے تھا مگر فاولئک ھم الظالمون بھی افادہ محض حصر کرتا ہے، پس اگر ایک حصر دین ہوگا تو ہمارے لیے محال ہو جائے گا۔ کہ فریق جنگ کے اعمال کا ان کی پوری جنس اور قوم کو ذمہ دار سمجھیں۔ اس صورت میں ہم "متمدن" نہ ہوں گے، بلکہ مسلمان ہوں گے، اور ہمارے

تمام اعمال تابع اسلام ہو جائیں گے۔ ہم دیکھیں گے کہ طرابلس میں ایک مسیحی قوم ہم پر ظلم وستم کر رہی ہے، کہ ہم ہندوستان میں تمام عیسائیوں سے دوستی وحسن معاملت کے ساتھ پیش آئیں گے اور ان کو اپنا دشمن نہیں سمجھیں گے، کیوں کہ یورپی مذہبیت نہیں۔ مگر خدا نے ہم کو ایسا ہی حکم دیا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ بلقان کی مسیحی سازش اور ان کے یورپین پس پردہ معاون محض ظلم وعدوان سے ہم پر حملہ آور ہیں مگر ہم ہندوستان میں کسی یورپین کو حتی کہ کسی بلغاری یا سرویین کو بھی تیز نظر سے نہ دیکھ سکیں گے۔ کیونکہ اس نے اسلام کے مقابلہ میں تلوار نہیں اٹھائی ہے۔ اور اگر ہم میں سے کوئی اس کے خلاف کرے گا۔ تو وہ حسب تعلیم قرآن خدا کی نظر میں مغضوب، اس کی محبت سے محروم اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مسلمان نہ ہوگا

پھر ہم کو ہمارے مخالفین صاف صاف تبلادیں کہ ان دونوں صورتوں میں سے وہ کون سی صورت پسند کرتے ہیں؟ جنگ مدنی یا جنگ دینی؟ "قتال وحرب یا قتال جہاد؟ اگر جہاد کا لفظ ان کو خوش نہیں آتا تو اعلان کر دیں تاکہ ہم بھی حرب دینی کو چھوڑ کر یورپ کی مدنی جنگ کو سیکھنے کی کوشش کریں۔

اخلاقی اور سیاسی انقلاب

تاریخ اسلام میں سینکڑوں واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی فتوحات کے سیلاب نے بہت سی قوموں کو دفعتہً بالکل بدل دیا۔ ہندوستان میں ہیٹ کے نیچے جو چھپے ہوئے سرلشتہ غرور تفریح و فرنگی مآبانی میں بدمست نظر آتے ہیں۔ جب ان کو ہوش آئے گا تو معلوم ہو گا کہ وہ عقل و بصیرت کی جگہ ایک ایسا ذلیل ترین دماغ رکھتے ہیں جو در پردہ اپنے ضعف اور دوسری قوموں کی قوت کا مہلک اعتراف کر رہا ہے، بلکہ یہی انجذاب قومی ہے جو ان کی جبیں نیاز کو اکثر ان کی چوکھٹ پر جھکا دیا کرتا ہے۔

یہ انقلاب اگرچہ بظاہر اپنے اندر بہت سی اخلاقی خوبیاں بھی دکھلاتا ہے یعنی فاتح قوم کے دل و دماغ جن اعلیٰ جذبات سے لبریز رہتے ہیں، مفتوح قوم بھی، انہی کو جذب کرنا چاہتی ہے لیکن سیلاب جب آتا ہے تو گوہر و مرجان سے زیادہ اپنے ساتھ خس و خاشاک کا ڈھیر بہا لاتا ہے اور اپنی یادگار میں اسی کو چھوڑ کر آگے چلا جاتا ہے، زمین کے حصے میں صرف یہی ڈھیر آتا ہے اور ایسے خوش قسمت بہت کم ہوتے ہیں جو صرف گوہر و مرجان سے اپنے دامن و جیب بھر لیتے ہیں۔ فاتحانہ حیثیت سے اخلاقی و تمدنی انقلاب بھی اسی طرح اضطراری طور پر ہوتا ہے اس لئے انسان کی قوت انتخاب بالکل بیکار ہو جاتی ہے اور فاتح جو کچھ دیدیتا ہے اسی کو جبراً قبول کر لینا پڑتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مفتوح قوم فاتح قوموں کی تقلید میں سینکڑوں غیر ضروری و غیر مفید بلکہ مضر چیزیں اختیار کر لیتی ہے اور خس و خاشاک کے ڈھیر میں صاف و گوہر بالکل چھپ جاتا ہے۔

فاتح قوم کی جو خوبیاں مفتوح قوم میں منتقل ہوتی ہیں۔ ان کا اثر صرف چند مخصوص

افرادی میں نمایاں ہوتا ہے۔ ہندوستان میں کوٹ پتلون پہن کر چلنے پھرنے والے ہر ہر گ پر نظر آ سکتے ہیں۔ لیکن انگریزوں کا سا اعلیٰ کیرکٹر اور قومی حریت تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی یکسر مفقود ہے۔

جنگ کے ذریعہ بعض اوقات فاتح قوم میں بعض نہایت شرمناک بداخلاقیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ فوج ایک مدت تک گھر سے باہر میدان جنگ میں اقامت گزیں رہتی ہے۔ زمانہ جنگ میں اس کے جذبات تو اسخت ہیجان کی حالت میں رہتے ہیں۔ بدامنی اس کو بہت کچھ مطلق العنان بنا دیتی ہے۔ اس لیے اس کے جذبات ہمہ سخت مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اس آگ کو ہر ممکن طریقہ سے بجھانا چاہتی ہے۔ پس مفتوح قوموں کی ہر چیز حالت جنگ میں مباح ہو جاتی ہے۔ عرب میں متعہ کا رواج اسی بنا پر ہوگیا تھا جس کو اسلام کی اخلاقی تعلیم نے بتدریج مٹا دیا۔ ایرانیوں میں عشق رجال کا رواج انہی غلاموں کے ذریعے سے ہوا جو لڑائیوں میں گرفتار ہو کر آئے تھے۔ رفتہ رفتہ انھوں نے اس قدر مقبولیت حاصل کرلی کہ فارسی لٹریچر کا ایک جزو لاینفک بن گئے۔ جن کو اگر علیحدہ کر دیا جائے تو فارسی شاعری کا دامن حسن دفعتہً خالی ہو جائے۔

ابتدا میں اہل عرب اس مرض سے بالکل ناآشنا تھے یہی وجہ ہے کہ قدیم شاعری کا دامن اس داغ سے بالکل پاک نظر آتا ہے۔ لیکن جب اہل عرب کی فتوحات کا سیلاب بڑھا اور اسلام کے دامن میں بھی حلقہ بگوش غلام آئے تو ابتدا میں فوجی خیموں کے اندر ان کو دخل ہوا پھر خلفائے عباسیہ کی بزم طرب کے شمع و چراغ ہو گئے۔ یہاں تک کہ ابو نصر عباسی نے عربی شاعری کے دامن پر بھی اس داغ کو لگا دیا۔

عیش پرستی کی یہ آخری سرحد ہے اور یہیں پہنچ کر ہر قوم فنا ہو جاتی ہے۔ آج جو عظیم الشان قوموں کی موت پر ماتم کرتے ہیں۔ ان کو صرف مادی طاقت ہی پر نظر نہیں رکھنی چاہیے، بلکہ ان اخلاقی تغیرات کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، جو سطوت عامہ کے جزر د

لا ینفک ہیں۔ اس طرح بھی حکیمانہ نگاہ سے ثابت ہوجائے گا کہ ترقی و تنزل صرف اخلاقی انقلابات کا نتیجہ ہیں، اس زبردست قوت کے سامنے مادی قوت نے ہمیشہ سر تسلیم خم کر دیا ہے، عرب کو اس اخلاقی طاقت نے ابھارا تھا، اور اسی کے تنزل نے ان کو موجودہ گمنامی تک پہنچا دیا۔

ولعل اللہ یحدث بعد ذالک امراً

ولادت نبی صلی اللہ علیہ وسلم

(جشن حصول و ماتم ضیاع)

لیکن جب کہ تم اس ماہ مبارک میں یہ سب کچھ کرتے ہو اور اس ماہ کے واقعۂ ولادت کی یاد میں خوشیاں مناتے ہو تو اس کی مسرتوں کے اندر تمہیں کبھی اپنا وہ ماتم بھی یاد آتا ہے جس کے بغیر اب تمہاری کوئی خوشی نہیں ہو سکتی؟ کبھی تم نے اس حقیقت پر بھی غور کیا ہے، کہ یہ کس کی پیدائش ہے جس کی یاد کے لیے تم سروسامان جشن کرتے ہو! یہ کون تھا جس کی ولادت کے تذکرہ میں تمہارے لیے خوشیوں اور مسرتوں کا ایسا عزیز پیام ہے؟

آہ! اگر اس مہینے کی آمد تمہارے لیے جشن و مسرت کا پیام ہے کیونکہ اس مہینے میں وہ آیا جس نے تم کو وہ سب کچھ دیا تھا، تو میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کسی مہینے میں ماتم نہیں، کیونکہ اس مہینے میں پیدا ہونے والے نے جو کچھ ہمیں دیا تھا، وہ سب کچھ ہم نے کھو دیا اس لیے اگر یہ ماہ ایک طرف بخشنے والے کی یاد تازہ کرتا ہے تو دوسری طرف کھونیوالوں کے زخم کو بھی تازہ ہو جانا چاہیئے۔

ما خانہ رسیدگان ظلمیم
پیغام خوش از دیار ما نیست

تم اپنے گھروں کو مجلسوں سے آباد کرتے ہو مگر تمہیں اپنے دل کی اجڑی ہوئی بستی کی بھی کچھ خبر ہے؟ تم کافوری شمعوں کی قندیلیں روشن کرتے ہو۔ مگر اپنے دل کی اندھیاری کو دور کرنے کے لیے کوئی چراغ نہیں ڈھونڈتے، تم پھولوں کے گلدستے

سجانے ہو، مگر آہ! تمہارے اعمال حسنہ کا پھول مرجھا گیا ہے، تم گلاب کے چھینٹوں سے اپنے رداں و آستین کو معطر کرنا چاہتے ہو مگر آہ تمہاری غفلت کہ تمہاری عظمت اسلامی کی عطر بیزی سے دنیا کی مشام روح یکسر محروم ہے! کاش تمہاری مجلسیں تاریک ہوتیں، تمہارے اینٹ اور چونے کے مکانوں کو زیب و زینت کا ایک ذرہ نصیب نہ ہوتا، تمہاری آنکھیں رات بھر مجلس آرائیوں میں نہ جاگتیں، تمہاری زبانوں سے ماہ ربیع الاول کی ولادت کے لیے دنیا کچھ نہ سنتی، مگر تمہاری روح کی آبادی معمور ہوتی، تمہارے دل کی بستی نہ اجڑتی، تمہارا طالع خفتہ بیدار ہوتا، اور تمہاری زبان سے نہیں مگر تمہارے اعمال کے اندر سے اسوۂ حسنۂ نبوی کی مدح و ثنا کے ترانے اٹھتے :— فانها لا تعمی الابصار ولٰکن تعمی القلوب التی فی الصدور۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ، تو نہ مر جائے

کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

پھر آہ وہ قوم، اور صد آہ اس قوم کی غفلت و نادانی، جس کے لیے جشن و مسرت میں پیام ماتم ہے، اور جس کی حیاتِ قومی کا ہر قہقہہ عیش فغان حسرت ہو گیا ہے، مگر نہ تو ماضی کی عظمتوں میں اس کے لیے کوئی منظر عبرت ہے، نہ حال کے واقعات و حوادث میں کوئی پیام تنبیہہ و ہوشیاری ہے، اور نہ مستقبل کی تاریکیوں میں زندگی کی کسی روشنی کو اپنے سامنے دیکھتی ہے، اسے اپنی کام جوئیوں اور جشن و مسرت کی بزم آرائیوں سے مہلت نہیں، حالانکہ اس کے جشن و طرب کے دور میں ایک ایک پیام ماتم و عبرت بھی رکھ دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ آنکھیں دیکھیں، کان سنیں اور دل کی دانائی غفلت و سرشاری نے چھین نہ لی ہو۔

ماہ ربیع الاول کی یاد میں ہمارے لیے جشن و مسرت کا پیام اس لیے تھا کہ اس مہینے میں خدا کا وہ فرمان رحمت دنیا میں آیا جس کے ظہور نے دنیا کی شقاوت و حرمانی کا موسم بدل دیا۔ ظلم و طغیان اور فساد و عصیان کی تاریکیاں مٹ گئیں خدا اور اس کے بندوں

کا ٹوٹا ہوا رشتہ جڑ گیا۔ انسانی اخوت و مساوات کی یگانگت نے دشمنیوں اور کینوں کو نابود کر دیا، اور کلمۂ کفر و ضلالت کی جگہ کلمۂ حق و عدالت کی بادشاہت کا اعلان عام ہوا۔

لقد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین یھدی بہ اللہ من اتبع رضوانہ سبل السلام۔

اللہ کی طرف سے تمہاری جانب ایک نور ہدایت اور کتاب مبین آئی۔ اللہ اس کے ذریعے اپنی رضا چاہنے والوں کو سلامتی اور زندگی کی راہوں پر ہدایت کرتا اور ان کے آگے صراط مستقیم کو کھولتا ہے

لیکن دنیا شقاوت و حرمان کے درد سے پھر دکھیا ہو گئی۔ انسانی شر و فساد اور ظلم و طغیان کی تاریکی خدا کی روشنی پر غالب ہونے کے لیے پھیل گئی، سچائی اور راست بازی کی کھیتیوں نے پامالی پائی اور انسانوں کے بے راہ گلہ کا کوئی رکھوالا نہ رہا۔ خدا کی وہ زمین جو صرف خدا ہی کے لیے تھی، غیروں کو دیدی گئی، اور اس کے کلمۂ حق و عدل کے غم گساروں اور ساتھیوں سے اس طرح خالی ہو گئی۔

ظھر الفساد فی البر والبحر بما کسبت ایدی الناس

زمین کی خشکی اور تری دونوں میں انسانوں کی پیدا کی ہوئی شرارتوں سے فساد پھیل گیا اور زمین کی صلاح و فلاح غارت ہو گئی۔

پھر آہ! تم اس کے آنے کی خوشیاں تو مناتے ہو پر اس کے ظہور کے مقصد سے غافل ہو گئے ہو، اور وہ جس غرض کے لیے آیا تھا، اس کے لیے تمہارے اندر کوئی خلش اور چبھن نہیں؟

یہ ماہ ربیع الاول اگر تمہارے لیے خوشیوں کی بہار ہے تو صرف اس لیے کہ اس مہینے میں دنیا کی خزاں و ضلالت ختم ہوئی اور کلمۂ حق کا موسم ربیع شروع ہوا۔ پھر اگر آج دنیا کی عدالت، سموم ضلالت کے جھونکوں سے مرجھا گئی ہے، تو اے غفلت پرستو! تمہیں کیا ہو گیا ہے، کہ بہار کی خوشیوں کی رسم تو مناتے ہو مگر خزاں کی پامالیوں پر نہیں روتے۔

یادگارِ حرّیت

تم ربیع الاول میں آنے والے کی یاد اور محبت کا دعوٰی رکھتے ہو اور مجلسیں منعقد کر کے اس کی مدح و ثنا کی صدائیں بلند کرتے ہو لیکن تمہیں کبھی بھی یاد نہیں آتا جس کی یاد کا تمہاری زبان دعوٰی کرتی ہے، اس کی فراموشی کے لیے تمہارا ہر عمل گواہ ہے اور جس کی مدح و ثنا میں صدائیں زمزمہ سرا ہوتی ہیں۔ اس کی عزت کو تمہارا وجود بٹہ لگا رہا ہے؟ وہ دنیا میں اس لیے آیا تھا تاکہ انسانوں کو انسانی بندگی سے ہٹا کر صرف اللہ کی عبودیت کو صراط مستقیم پر چلائے اور غلامی کی ان تمام زنجیروں سے ہمیشہ کے لیے نجات دلادے جن کے بڑے بڑے بوجھل حلقے انھوں نے ڈال لیے تھے۔

پس اگر ربیع الاول کا مہینہ دنیا کے لیے خوشی و مسرت کا مہینہ تھا، تو صرف اس لیے کہ اس مہینے میں دنیا کا وہ سب سے بڑا انسان آیا جس نے مسلمانوں کو ان کی سب سے بڑی نعمت یعنی خدا کی بندگی اور انسانوں کی آقائی عطا فرمائی اور اس کو اللہ کی خلافت دنیا بت کا لقب دے کر خدا کی ایک پاک و محترم امانت ٹھہرایا۔ پس ربیع الاول انسانی حریت کی پیدائش کا مہینہ ہے، غلامی کی موت و ہلاکت کی یادگار ہے، خلافت الٰہی کی بخشش کا اولین یوم ہے، وراثت ارضی کی تقسیم کا اعلان ہے، اسی ماہ میں کلمۂ حق و عدل زندہ ہوا اور اسی میں کلمۂ ظلم و فساد اور کفر و ضلالت کی لعنت سے خدا کی زمین کو نجات ملی۔

لیکن آہ تم تو اس ماہ حریت کے ورود کی خوشیاں مناتے ہو اور اس کے لیے ایسی تیاریاں کرتے ہو، گویا وہ تمہارے ہی لیے اور تمہاری ہی خوشیوں کے لیے آیا ہے، خدا را مجھے بتلاؤ کہ تم اس پاک اور مقدس یادگار کی خوشی منانے کا کیا حق ہے؟ کیا موت اور ہلاکی کو اس کا حق پہنچتا ہے کہ زندگی اور روح اپنے کو ساتھی بنائے؟ کیا ایک مردہ لاش پر دنیا کی عقلیں نہ ہنسیں گی، اگر وہ زندوں کی طرح زندگی کو یاد کرے گی۔ ہاں یہ سچ ہے کہ آفتاب

کی روشنی کے اندر دنیا کے لیے بڑی ہی خوشی ہے، لیکن ایک اندھے کو کب زیبا دیتا ہے کہ وہ آفتاب کے نکلنے پر آنکھوں والوں کی طرح خوشیاں منائے؟ پھر تم بتلاؤ کہ تم کون ہو؟ تم غلاموں کا ایک گلہ ہو جس نے اپنے نفس کی غلامی، اپنی خواہشوں کی غلامی، ماسوائے اللہ رشتوں کی غلامی اور غیر الٰہی طاقتوں کی غلامی کی زنجیروں سے اپنی گردن کو چھپا دیا ہے، تم پتھروں کا ایک ڈھیر ہو، جو نہ تو خود ہل سکتا ہے اور نہ اس میں جان اور روح ہے البتہ چور چور ہو سکتا ہے اور ایک دوسرے پر پٹکا جا سکتا ہے۔ تم غبار راہ کی ایک مشت ہو جس کو ہوا اڑا لے جائے تو اڑ سکتی ہے ورنہ وہ تو خود صرف اس لیے ہے تا کہ ٹھوکروں سے روندی جائے اور جولانیٔ قدم سے پامال کی جائے۔

گلگونۂ عارض ہے نہ ہے رنگ حنا تو
اے خون شدہ دل، تو تو کسی کام نہ آیا

پس اے غفلت کی ہستیو، اور اے بے خبری کی سرگشتہ خواب رو حوالم کس منہ سے اس کی پیدائش کی خوشیاں مناتے ہو جو حریت انسانی کا [illegible]ن، حیات روحی و معنوی کے عطیہ اور کامرانی و فیروزمندی کی خوشخبری دلوں کے لیے آیا تھا۔ افسوس اللہ غفلت کی کی نیرنگی اور انقلاب کی بوقلمونی، ماسوائے اللہ کی عبودیت کی زنجیریں پاؤں میں ہیں، انسانوں کی ملوکیت و مرعوبیت کے حلقے گردنوں میں، ایمان باللہ کے ثبات سے دل خالی، اور اعمال حقہ و حسنہ کی روشنی سے روح محروم! ان سامانوں اور تیاریوں کے ساتھ تم مستعد ہو کر ربیع الاول کے آنے والے کی یاد کا جشن مناؤ۔ جس کا آنا ماسوا کی عبودیت کی فتح، غیر الٰہی عبودیت کی ہلاکت، حریت صادقہ کا اعلان حق، عدالت حقہ کی ملوکیت کی بشارت اور امت عادلہ و قائمہ کے تمکن و قیام کی بنیاد تھا۔ کما لھؤلاء القوم لا یکادون یفقھون حدیثا۔

پس اے غفلت شعار ابنائے ملت! تمہاری غفلت پر صد فغان و حسرت اور تمہاری

سرشاریوں پر صد ہزار نالہ و بکا۔ اگر تم اس ماہِ مبارک کی اصلی عظمت وحقیقت سے بے خبر ہو اور صرف زبانوں کے ترانوں، اور دیواروں کی زرافشانیوں اور روشنی کی قندیلوں ہی میں اسی کے مقصد یادگاری کو گم کردو۔ تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ ماہ مبارک، امت اسلامیہ کی بنیاد کا پہلا دن ہے، خداوندی بادشاہت کے قیام کا اولین اعلان ہے، خلافت ارضی و وراثت الٰہی کی بخشش کا سب سے پہلا مہینہ ہے۔ پس اس کے آنے کی خوشی اور اس کے تذکرہ و یاد کی لذت اس شخص کی روح پر حرام ہے جو اپنے ایمان اور عمل کے اندر اس پیام الٰہی کی تعمیل و اطاعت اور اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کے لیے کوئی نمونہ نہیں رکھتا۔

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ أَحْسَنَهُ أُولٰئِكَ الَّذِيْنَ هَدَاهُمُ اللّٰهُ وَأُولٰئِكَ هُمْ أُولُو الْأَلْبَابِ۔

مجوزہ شیعہ کالج

علی گڑھ کالج و علی گڑھ کانفرنس کے ارباب حل و عقد کا رویہ

علی گڑھ کالج اور علی گڑھ کانفرنس کے ارباب حل و عقد نے ہمیشہ دعویٰ کیا ہے کہ ہمارا موضوع مسلمانوں کی جدید تعلیم اور علی الخصوص اعلیٰ تعلیم ہے، ہمارا موضوع پالٹیکس نہیں ہے۔ پس پولیٹیکل معاملات میں ہم سے کسی آزادانہ رویے کی خواہش کرنا ایک ایسی چیز کا مطالبہ ہے جو ہمارے دائرہ عمل ہی سے باہر ہے، البتہ تعلیم کے متعلق ہم سب کچھ کر سکتے ہیں اور کر رہے ہیں۔

انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے متعلق ایک خاص اصول وضع کیا ہے۔ اور ہمیشہ سے کہتے آئے ہیں کہ مسلمانوں کی تعلیمی حیات و ممات کا دار و مدار اسی اصول پر ہے، اس اصول کو وہ۔ ایک قومی مرکز کے قیام و تکمیل کے نام سے پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لئے صرف تعلیم ہی کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ تعلیم سے کہیں زیادہ ایک قومی مرکز کے قائم کرنے کی ضرورت ہے، جب تک کہ ایک ایسا مرکز موجود نہ ہوگا متفرق کوششیں کچھ سود مند نہیں ہو سکتیں پھر اس کے بعد دعویٰ کرتے ہیں کہ علی گڑھ کالج ہی مسلمانوں کا قومی مرکز ہے، اور اس کے قیام و تکمیل پر مسلمان کی تمام حیات و ممات کا قومی دار و مدار ہے۔

ان کی اصل کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کو دنیا بھر کی چیزوں کا مرکز ثابت کریں لیکن جب اس میں کامیابی نہیں ہوتی تو مجبوراً تعلیمی مرکز۔ کے قرار دینے ہی پر

اکتفا کر لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ دین و دنیا کا اور کوئی کام نہ کریں صرف کالج ہی کو پڑھیں اور صرف کالج ہی کو روپیہ دیں۔ تجاھدوا فی سبیلہ باموالکم و انفسکم۔ اگر وہ ایسا نہ کریں گے، اور کاموں میں لگ جائیں گے تو مرکز نہ ہوگا، اور مرکز نہ ہوا تو پھر قوم نہیں۔

نیز ان لوگوں نے اپنی تقلید اور پرستش کا ایک نیا بت بنایا ہے اور اس کا نام رکھا ہے "سر سید کی پالیسی" یونانی علم الاصنام میں ہر طاقت کے لئے ایک مخصوص بت ہوتا تھا۔ یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ رزق کا دیوتا علم کے دیوتے کے کاموں میں مداخلت کرے، یا کیوپڈ وینس کی حکومت میں خلل ڈالے لیکن ان لوگوں نے صرف ایک ہی بت بنایا ہے، اور اس کے اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ علم و عمل کا کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم "سر سید کی پالیسی" سے سر مو تجاوز نہیں کریں گے اور مسلمان صرف وہی ہے جو "سر سید کی پالیسی" پر نہ صرف ایمان مجمل بلکہ ایمان مفصل کا اقرار کرے۔

سر سید مرحوم کی پالیسی کا اس بارے میں یہ حال تھا کہ انھوں نے پہلی لکھنؤ کانفرنس اور نیز میرٹھ کانفرنس میں خاص ریزولیوشن پیش کیے کہ جب تک مسلمان اپنی تمام متفرق اور علیحدہ علیحدہ کوششوں کو ترک کر کے ایک مکمل تعلیمی مرکز نہیں بنالیں گے ان کی کشتی طوفان ہلاکت سے نہیں نکلے گی۔ چنانچہ انھوں نے اسی ریزولیوشن کا نام مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ رکھا، اور ہمیشہ دوسرے کالجوں، اسکولوں اور مستقل تعلیمی کوششوں کی مخالفت کرتے رہے حتیٰ کہ لکھنؤ کانفرنس میں ان کو اسی مسئلہ کے متعلق اس قدر جوش آگیا کہ بہت سے لوگ اس کے متحمل نہ ہو سکے، مرحوم سجاد حسین ایڈیٹر اودھ پنچ نے کھلیاں اڑائیں اور لوگ جلسے سے اٹھ کر چلے گئے

ان تمام امور کے علاوہ سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے آپ کو اتحاد و جمعیۃ

کلمہ کا داعی قرار دیتے ہیں اور اسی بنا پر شیعہ مطالبات کا ایک بڑا حصہ ان لوگوں نے منظور نہیں کیا۔ کیونکہ اس کے ماننے سے مسلمانوں میں تفریق بڑھتی۔

مجھ کو یہاں اس سے کوئی بحث نہیں کہ ان کے یہ تمام مسالک و عقائد صحیح ہیں یا غلط؟ بحث صرف یہ ہے کہ ان کے معیاری عقائد کا یہ حال ہے، پس اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مجوزہ شیعہ کالج کا وجود ان کے ان عقاید مسلمہ اور ان کے امام معصوم کے نیابت ولایت کے لحاظ سے کیا حکم رکھتا ہے؟

کیا ایک علیحدہ کالج قائم کرنا ان کے اصول مرکزیت کے لیے پیغام ہلاکت نہیں ہے؟

کیا شیعہ کالج کے نام سے اس کی دعوت نہ کلمۂ اتحاد کے لیے فتنۂ عظیم نہیں ہے؟

کیا علی گڑھ کالج کے اندر دو مسجدوں کا بنانا تفریق تھا، مگر "شیعہ کالج" کی بنیاد رکھ کر آب و ہوائے تفریق میں آئندہ نسلوں کو تیار کرنا تفریق نہیں ہے؟ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ شیعہ کالج کی اصل بنیاد علی گڑھ کالج ہی کی مخالفت سے پڑی اور اس طرح علیگڑھ کالج کے احاطۂ دائرہ کو نقصان پہنچایا جا رہا ہے۔ کیا اس کالج کا وجود "سرسید" کی مسلمہ پالیسی اور اسلامک مرکز جمعیۃ فریقین کے لیے جس پر محمڈن کالج کی بنیاد رکھی گئی تھی سخت مہلک نہیں ہے؟ کیا ارکان کالج میں ہر متنفس کا اعتقاد و علم راسخ نہیں ہے کہ یہ تحریک موجودہ عہد کی سب سے زیادہ مضر تحریک ہے، اور اس سے سخت نقصان مسلمانوں کو پہنچے گا۔

اگر ان تمام سوالوں کا جواب اثبات میں ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ علی گڑھ پارٹی نے اس وقت تک اس کی مخالفت و اصلاح اور کلمۂ حق کے اعلان کے لیے کیا کارروائی کی ہے؟ آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس نے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کا موضوع صرف مسئلہ تعلیم ہے مسئلہ تعلیم قومی کی اس بحیر ہلاکت و بربادی کے لیے کون سی

صدا بلند کی ہے؟ یہ کیا ہے کہ علی گڑھ کالج کی بستی کا ہر فرد یکسر انگوٹھا بن گیا ہے جیسا کہ سرسید نے نہیں بلکہ صاحب شریعت نے کہا ہے کہ الساکت عن الحق شیطان اخرس اور یہ کون ہے جس نے تمام مصالحین قوم، ماہرین فلسفہ، تعلیم اور مجددین ملت حاضرہ کی زبانوں پر ایسے قفل چڑھادیئے ہیں کہ کسی کے حلق سے آواز نہیں نکلتی۔ اور سب پر ہلاکت کی چپ اور موت کی خاموشی چھاگئی ہے؟ اموات غیر احیاء وما یشعرون ایان یبعثون۔

تمہارا مسلک مرکزیت اب کہاں فنا ہوگیا؟ تمہاری دعوت قومیت کس گوشے میں دفن کردی گئی؟ تمہاری چہل سالہ محنت اکارت جارہی ہے، تم کہاں چھپ گئے ہو تمہارے امام معصوم کا مذہب ذبح کیا جارہا ہے، تم کیوں نہیں بولتے؟ تمہاری شریعت تعلیم مٹائی جارہی ہے، تمہارے گلوں میں پھندے کیوں پڑگئے ہیں۔ یا سبحان اللہ اگر ایک مسلم اللہ اور رسول کے نام کی دعوت دے تو اس پر اپنی کانفرنس کا دروازہ بند کرنا چاہتے ہو، اور کہتے ہو کہ سب سے پہلے سرسید پر ایمان لانے کا اقرار کرے اس کے بعد وہ تقریر کرسکتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا جرم یہ ہے کہ اس نے سرسید کی شریعت سے انحراف کیا۔ لیکن آج سرے سے علی گڑھ کالج کا اصول بنیادی منہدم کیا جارہا ہے اور سرسید کی مرکزیت کی دھجیاں اڑ رہی ہیں۔ مگر تم سب پر نفاق کی موت طاری ہوگئی ہے اور تم سب مردوں کی طرح بے حس نہ حرکت پڑے ہو؟

تم کہتے ہو کہ ہمارا دائرہ عمل قومی تعلیم ہے، سیاست نہیں ہے، اچھی بات ہے۔ لیکن اب بتلاؤ کہ یہ جو کچھ ہے سیاست ہے یا تعلیم؟ اگر قومی تعلیم کا مسئلہ ہے تو تمہاری تو بہت اور قومی تعلیم کی لن ترانیاں کہاں دفن ہوگئیں؟

تم بھلا ان سوالات کا جواب کیا دوگے، میں خود ہی حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہوں تاکہ ہر انسان تمہاری اصل صورت دیکھ لے، اور معلوم ہو جائے کہ حق سے تمہارا

رشتہ کیا ہے؟ نہ تو تمہارے اعتقادات بدلے ہیں اور نہ ہی تمہارے مسلک پر کوئی موت طاری ہوئی ہے، بلکہ اصل مصیبت یہ ہے کہ تمہارے دل پر موت چھا گئی ہے اور تمہارے ایمان نے تم کو چھوڑ دیا۔ اصل یہ ہے کہ تمہارے صوبے کا سب سے بڑا عالم علانیہ شیعہ کالج کی تحریک کا ساتھ دے رہا ہے، اور کیسے بناوٹ اس کی حمایت کر رہا ہے۔ یہ دیکھ کر تمہارے ہوش و حواس غائب ہو گئے ہیں، اور بارے ڈر اور ہیبت کے تمہاری جان نکلی جا رہی ہے تم دیکھتے ہو مگر بول نہیں سکتے، تم کہتے ہو کہ ہم نے ذرا بھی زبان ہلائی تو عجب نہیں کہ ہم دربار شاہی سے دور ہو جائیں۔ نخشی ان تصیبنا دائرۃ

یہ ہے تمہاری حق پرستی، یہ ہے تمہاری صداقت، یہ ہے تمہاری مدت العمر کے دعوؤں اور لن ترانیوں کی کائنات و حقیقت! آہ! ایک انسان کے ڈر نے تمہاری روح پر ایسی ہلاکت طاری کر دی ہے کہ تم اس چیز کو زبان سے نہیں نکال سکتے جس کو تمہارا دل حق کہہ رہا ہے، اے سست ایمالو! تم انسان سے ڈرتے ہو۔ مگر افسوس کہ تمہارے دل سے خدا کا خوف اس طرح نکل گیا ہے جس طرح کبوتر اپنے گھونسلے سے اڑ جاتا ہے۔

علی خوف من فرعون وملائھم ان یفتنھم (١٠: ٨٢)

یہی وہ مقام ہے جہاں آکر تم میرے مقابلے میں بیدست و پا ہو جاتے ہو؛ اور تمام دنیا دیکھ لیتی ہے کہ حق کس کے ساتھ ہے؟ اس کے ساتھ ہے جو اعلان حق کی وجہ سے اپنی زندگی کو ہر وقت خطروں اور ہلاکتوں میں گھرا ہوا دیکھتا ہے پھر بھی اعلائے کلمۃ الحق سے باز نہیں رہ سکتا، یا ان کے ساتھ ہے جو اپنی پچاس سالہ کمائی کو صرف ایک انسان کی دہی خوف اور ہیبت کی وجہ سے اپنے ہاتھوں تاراج کر رہے ہیں؛ فَاَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔

انگریزی عہد میں کونسل کی تاریخ میں کا سان ازلی کا تذکرہ

کونسل کے اندر اظہار قابلیت کے متعدد مواقع ہیں۔ سب سے پہلی چیز تو مناسب اور ممکن النفاذ قوانین کا مسودہ پیش کرنا ہے، پھر عام مباحث و مذاکرات میں علم و قابلیت اور اجتہاد فکر و رائے کے ساتھ حصہ لینا، ہر معاملہ اور قانون سے متعلق مکمل مصالح اور اغراض کی حمایت کرنا، سرکاری تجاویز و خیالات کے بے اعتدلانہ اثر کی اعتدال و قابلیت کے ساتھ مخالفت کرنا، بجٹ وغیرہ کے اہم مواقع پر عمدہ اور مفید مباحث و اتفاقات پیش کرنا۔ ملک کی عالم حالت پر نظر رکھنا، اور اسی کے درس و مطالعہ سے کونسل کے کاموں میں مدد لینا، شمار و اعداد کو ہر معاملے کی نسبت خاص طور پر محفوظ رکھنا، اور ہر بحث میں ان سے کام لینا، مفید اور نتیجہ خیز سوالات کرنا، اور ان کے جوابات سے ملک کی عام معلومات اور رائے میں اضافہ اور حکومت کی غلطیوں کا انکشاف کرنا، یہ، اور اسی طرح کے صدہا مواقع ہیں کہ ایک قابل شخص کی قابلیت کے لیے کونسل ہال آزمائش ہو سکتے ہیں۔

پھر حق گوئی اور راست بیانی ایک جوہر اصلی ہے، جس کی ہر موقعہ پر ضرورت رہتی ہے۔ اور جو ایک روشنی ہے، جس سے کونسل ہال ہی نہیں بلکہ ہر جگہ روشن ہو سکتی ہے۔

لیکن افسوس کہ اس تمام عہد گزشتہ و رواں میں مسلمان ممبروں نے ان تمام امور میں سے کسی ادنیٰ ترین کام کا بھی اپنے تئیں اہل ثابت نہیں کیا۔

البتہ ایک چیز ہے، جس کی قابلیت کا انہوں نے ہر موقعہ ثبوت دیا۔ اور ایسا قاطع و بالغ، کہ ہندوستان کی کوئی قوم اس کے مقابلے میں اپنے عجز صریح کو نہیں چھپا سکتی

یعنی ملک اور ملکی امیدوں کی تاریکیاں، جہل و نادانی کے ساتھ ہر سرکاری خواہش کا استقبال، اور ہر صدائے حکومت کے آگے بلا تامل رکوع و سجود۔ اور یہ وہ صفت ملکوتی ہے جو ملاء اعلی کے گروہان عالم بالا کے لیے بھی بہترین وصف ہے، چہ جائیکہ کونسل ہال میں انسانوں کے لیے کہ:-

لَا یَسْبِقُوْنَہٗ بِالْقَوْلِ وَھُمْ بِاَمْرِہٖ یَعْمَلُوْنَ

(سورہ انبیاء میں یہ آیت فرشتوں کی تعریف میں ہے یعنی وہ اللہ کے احکام پر ایسے عامل ہیں کہ اس کے کسی حکم کے خلاف نہیں کرتے۔)

اس سے بھی زیادہ دردانگیز یہ بات ہے کہ برائی کے ظہور کی اصلاً دو شکلیں ہوتی ہیں۔ ایک نیکی کا عدم، اور دوسرا بدی پر اصرار۔ پہلی صورت بہتر ہے، اگر دوسری صورت پیش نہ آئے۔ ایک شخص کچھ نہیں کرتا، یہ بری بات ہے لیکن اس شخص سے تو وہ ہزار درجہ بہتر ہے جو نہ صرف یہ کہ نیک کام نہیں کرتا، بلکہ اس سے بھی زیادہ یہ کہ برائیوں پر مصر ہے۔

مرا بخیر تو امید نیست، شر مرسال

مسلمان ممبروں نے اتنا ہی نہیں کیا کہ اپنے وجود سے کچھ کام نہیں لیا، بلکہ اس سے زیادہ یہ کہ جب کبھی کچھ کام لیا بھی تو یہی لیا کہ ملک کو نقصان پہنچایا، اور ہمیشہ اس کی بہتری امیدوں کے لیے ایک سنگ گراں بن کر حائل راہ رہے۔ یہ ہماری پیشانی پر ایک ایسا داغ سیاہ ہے، جو افسوس کہ مٹ نہیں سکتا۔



تحریکِ آزادی اور مسلمان

جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ یقیناً ایک
دن آئے گا جب کہ ہندوستان کا آخری سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا۔ غلامی کی وہ بیڑیاں جو
خود اس نے پاؤں میں ڈال لی ہیں بیسویں صدی کی ہوائے حریت کی تیغ سے کٹ کر گر چکی ہوں گی
اور وہ سب ہو چکے ہوں ، جس کا ہونا ضروری ہے۔ فرض کر لیجیے کہ اس وقت ہندوستان
کی ملکی ترقی کی ایک تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندوستان کے سات کروڑ
انسانوں کے متعلق کیا لکھا جائے گا؟

اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بدبخت اور زبوں طالع قوم ، جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لیے
ایک روک ، ملک کی فلاح کے لیے ایک بدقسمتی ، راہ آزادی میں سنگِ گراں ، حاکمانہ طمع
کا کھلونا ، دستِ احباب میں بازیچۂ لعب ، ہندوستان کی پیشانی پر ایک گہرا زخم اور
گورنمنٹ کے ہاتھ ملک کی امنگوں کو پامال کرنے کے لیے ایک بہترین کری ، اس میں لکھا
جائے گا کہ ایک قابلِ رحم مگر مسحور انسانوں کا گلہ جس کے ہر فرد کو کسی زبردست کاہن نے
اپنے منتر سے جانور بنا دیا تھا۔ جو اپنے نچانے والے آقا کے ہاتھ میں اپنی گردن کی رسی دیکھتا
تھا اور خوش ہوتا تھا۔ جس میں کوئی انسانی آرزو ، کوئی انسانی دماغ ، کوئی انسانی حرکت
اور کوئی انسانی زندگی کا ثبوت نہ تھا۔ جو اپنے دماغ سے نہ سوچ سکتا تھا ، نہ اپنی آواز سے
بول سکتا تھا نہ اپنے پاؤں سے چل سکتا تھا اور نہ اپنے ہاتھوں کو اپنا ہاتھ سمجھ کر اٹھا سکتا
تھا۔ ایک معمول جو مسمرائزر کے ارادہ پر زندہ ہو ، ایک وجود شل ، جو صرف زمین کے لیے بار ہو ،
ایک درخت جو حرکت کے لیے ہوا کا منتظر ہو ، ایک پتھر جو بغیر کسی ذی روح کے حرکت نہ

بل نہ سکتا ہو اور سب سے آخر یہ کہ ایک بدبختی کا داغ جو انسان کی پیشانی پر ہو۔

پھر اس میں لکھا جائے گا کہ یہ حالت اسی قوم کی تھی جو آہ! کہ "مسلم" تھی جو اپنے ساتھ انسانی شرف و جلال کی ایک عظیم ترین تاریخ رکھتی تھی، جس کو دنیا کی وراثت و خلافت دی گئی تھی، جو دنیا میں اس لیے بھیجی گئی تھی تاکہ انسانی استبداد و استعباد کی زنجیروں سے بندگانِ الٰہی کو آزاد کرائے، جو اس لیے بھیجی گئی تھی کہ بیڑیوں کو کاٹے نہ اس لیے کہ خود اپنے پاؤں میں بیڑیاں پہنے، جو اس لیے آئی تھی کہ تمام ان زنجیروں کو جو خدا کی بندگی کے سوا اور شیطانی قوتوں کی اسیری وہ استیلا جو اللہ کے ماسوا ہے اسلام کی اصطلاح میں کچھ بھی نام رکھتا ہے، انسان کی گردنوں میں ٹکڑے ٹکڑے کر دے، نہ اس لیے کہ سب سے بھاری زنجیر کو خود ہی اپنی گردن کا زیور بنائے جو خدا کی نائب اور خلیفہ تھی، تاکہ دنیا کو اپنا محکوم بنائے، نہ یہ کہ خود محکومی پر ناز کرے جس کے قدموں پر قوموں کو گرنا تھا نہ یہ کہ وہ خود سناک و مذلت و غلامی پر لوٹے اور ٹھکرائی جائے۔

جو اس بات حقیقی کی پیروی تھی جو دنیا میں صرف اس لیے ہے کہ حاکم ہو نہ اس لیے کہ غلام اور مملوک ہو، آہ! جو "مسلم" تھی۔ اور پھر کونسا انسانی شرف باقی رہ گیا ہے جو اس اللہ کے منہ سے نکلے ہوئے خطاب محبوب و اقدس میں نہیں ہے جو "مسلم" تھی اور اس لیے قدرتی طور پر اس کا فرض تھا کہ:-

ہندوستان کی آزادی اور ملک کی ترقی کا جھنڈا اس کے ہاتھ میں ہوتا اور ہندوستان کی تمام قومیں اس کے پیچھے ہوتیں، کیوں کہ اس کے پاس "اسلام" تھا اور "اسلام" آگے رہنے کے لیے ہے پیچھے رہنے کے لیے نہیں۔

وہ ایک قوت ہے تاکہ قومیں اس کے آگے جھک کر روحانی و جسمانی نجات پائیں پر وہ کسی کے آگے جھکنے کی محتاج نہیں ہے۔

دماغ سوچنے کے لیے ہے نہ کہ غفلت کے لیے، پس تمہارے پاس دماغ ہے۔

تو اے غفلت کو بیداری، اور موت کو حیات سمجھنے والو! خدارا مجھ کو تبلاؤ کہ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر تمہاری نسبت کیا لکھا جائے گا؟ یقین کرو اس وقت جب کہ یہ سطریں لکھ رہا ہوں میرے دل میں ایک سخت اضطراب ہے، میری روح بے چین ہے، میرے جگر میں ٹیس ہے، میرے دل کے زخموں کے ٹانکے کھل گئے ہیں اور میرے ہیجان و افکار کا ساتھ دینے سے قلم عاجز آ گیا ہے، یہ کیا ہے کہ میں ایک شے کو اپنے سامنے دیکھ رہا ہوں، تم سب کے پاس بھی آنکھیں ہیں مگر تم کو نظر نہیں آتا؟ یہ کیا ہے کہ ایک آواز میرے کانوں میں آ رہی ہے، میں سن رہا ہوں پر تم نہیں سنتے؟ آہ! اے لوگو میں نہیں سمجھتا، تم کو کیا کہوں، مجھ کو خدارا تبلاؤ کہ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ تم دین قوم کے پیرو، خطاب اسلام سے متصف اور امانت الٰہی کے حامل ہو؟ یہ سچ ہے تو تم صرف اس لیے ہو تاکہ نڈر ہو، بے خوف ہو، جری ہو، آزاد ہو۔ خود مختار ہو، نہ صرف اتنا ہی کہ خود آزاد ہو، بلکہ قوموں کو آزادی بخشنے والے، اور ملکوں کو استبداد سے نجات دلانے والے ہو، اور میں آگے بڑھتا ہوں کہ تم اس لیے ہو کہ تم جانفروش ہو، تا کہ راہِ حق میں سر بکف ہو، پھر یہ کیا ہے کہ سب باتیں غیروں میں دیکھتا ہوں لیکن اے بد بختو تم ان سے محروم ہو، یہ کیا بوالعجبی اور کیا تماشائے عقل سوز ہے۔

اگر تم کہو کہ تاریخ ہند میں ہمارے لیے بھی ایک شرف و عظمت کا باب ہے تو تم خاموش ہو اور مجھ سے کہو، میں اسے پڑھ دوں۔ بیشک ایک باب ہوگا۔ مگر جانتے ہو کہ اس میں کیا ہوگا؟ اس میں لکھا ہوگا کہ ہندوستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا، ہندوؤں نے اس کے لیے اپنے سر کو ہتھیلی پر رکھا مگر مسلمان غاروں کے اندر چھپ گئے، انہوں نے پکارا مگر انہوں نے اپنے منہ اور زبان پر قفل چڑھا دیئے۔ ملک غیر منصفانہ قوانین کا تماشا گاہ تھا، ہندوؤں نے اس کے لیے جہاد شروع کیا۔ پر اس قوم مجاہد نے یہی نہیں کیا کہ صرف چپ رہی بلکہ مجنونانہ چیخ اٹھی کہ تمام کام کرنے والے باغی ہیں۔

ملک کی ایک خاص زرعی ملک تھا۔ اس کے کاشتکار تباہ ہو رہے تھے، ملک کی

دولت انگلستان کے معدے میں بھری جا رہی تھی اور اس طرح ہضم ہو جاتی تھی کہ چند لمحوں کے بعد پھر "ہل من مزید" کا نعرہ سنائی دیتا تھا۔ ریلوے کی توسیع کے انگلستان کو ٹھیکے دیے جا رہے تھے تاکہ وہ دولت جذب کرے مگر آب پاشی کے لیے روپیہ نہ تھا کہ ہندوستان کی زمین اپنی دولت اگلے۔ زبان سے اقرار کیا جاتا تھا کہ وفادار رہو ـ کہ تم غدار ہو۔ ملک کی تمام دولت ستر ہزار سرخ رنگ سپاہیوں کو سونا چاندی کھلا کر سلائی جا رہی تھی. گر ملک کے فاقہ مست کالے تعلیم اور حفظان صحت کے انتظام سے محروم تھے. نمک بھی ملتا تو محصول دے کر، اور تعلیم بھی ملتی تو گھر بار بیچ کر، پھر زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے محبت کے لہجہ میں دعوہ کیا گیا کہ تمیز رنگ و زبان اور امتیاز حاکم و محکوم کا یہاں سوال نہیں اور جو راہ اپنے لیے باز ہے ہی سب کی آمد کی منتظر لیکن جب پاؤں اٹھے اور ہاتھوں نے حرکت کی تو تمام دروازے بند تھے اور امتیاز حاکم و محکوم کے نشے سے ہر انگلستان کی مٹی کا پتلہ مخمور

یہ اور ایسے ہی حالات تھے جن میں ملک مبتلا تھا، ہندو اٹھے اور انھوں نے اپنی تمام قوتوں کو ملکی جہاد کے لیے صرف کر دیا. لیکن عین اس وقت جب کہ وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے، مسلمانوں نے نہ صرف اپنے ہی ہاتھ پاؤں توڑے بلکہ چاہا کہ جن کے ہاتھ پاؤں ہیں ان کو بھی اپنا سا لنگڑا لولا بنا دیں. جب کہ وہ ملک اور ملک کی آزادی کی آگ سلگا رہے تھے، تو یہ تعلیم کی ایک ٹھنڈی لاش لیے بیٹھے تھے۔ ان کے کانوں میں ایک جادو کا منتر پھونک دیا گیا تھا کہ "دور" ما نہیں آیا، اور یہ اسی پر مسحور تھے، ایک الف لیلہ کا عفریت تھا. جس نے جادو کے زور سے ان کو پتھر کی چٹان بنا دیا تھا، پس یہ ملک کی راہ میں روک بن کر پڑے رہے،

اس کے بعد وہ آنے والا مورخ جو ہندوستان کا وقائع نگار ہوگا، لکھے گا بالآخر وہ سب کچھ ہوا جو ہونا تھا. بیسویں صدی میں کوئی غلام نہیں رہ سکتا تھا. اور

نہیں رہا۔ برٹش گورنمنٹ ایک کانسٹی ٹیوشنل گورنمنٹ تھی، چنگیز خاں کا تخت قہر
تھا۔ پس ملک آزاد ہوا اور انگلستان نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ لیکن دنیا یاد رکھے کہ جو کچھ
ہوا، اس قوم کی سرفروشی سے ہوا، جو مسلم نہ تھی، پر جو مسلم نہ تھے، انہوں نے ہمیشہ
آزادی کی غلامی کی، اور سربلندی کی بجگہ سجدۂ مذلت کی کوشش کی۔ ہندوستان کی
ملکی تجارت یقیناً ایک عظمت و عزت کی یادگار ہے۔ لیکن اس عزت میں مسلمانوں کا کوئی
حصہ نہیں۔ اگر ملک کے قوانین کی ترمیم ہوئی۔ نئے مفید قوانین بنائے گئے، برباد کن
محصولوں اور ٹیکسوں سے انسانوں نے نجات پائی۔ تعلیم جبری اور عام ہوئی۔ فوجی
مصارف میں تخفیف ہوئی۔ اور سب سے آخر یہ کہ ملک کو حکومت کی خود اختیاری
ملی تو صرف ہندوؤں، قابل عزت ہندوؤں ہی کو۔ ہندو مسلمانوں کے لیے تازیانہ
عبرت ہندوؤں کی وجہ سے کیونکہ انھوں نے پالیٹکس شروع کیا۔ اور پھر پالیٹکس اسی
کو سمجھا، مگر مسلمانوں نے اس کو معصیت سمجھ کر کنارہ کشی کی، اور جب شروع بھی کیا
تو شیطان نے سمجھایا کہ گورنمنٹ کے آگے سجدہ کریں، یا اس کے آگے بھیک مانگنے کے لیے
روئیں اور کبھی مانگے بھی تو اشرفی نہیں۔ چاندی سونا نہیں، لعل و جواہر نہیں بلکہ تانبے کا
ایک زنگ آلود ٹکڑا یا سوکھی روٹی کے چند ریزے،

مسلمان اور کانگریس

میں ابھی ابھی کہہ چکا ہوں کہ مجھ سے زیادہ کوئی شخص اس بات کا خواہشمند نہ ہوگا کہ مسلمان کانگریس میں شریک ہوں. لیکن مسلمانوں سے صاف صاف کہہ دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ معاملہ کو اس صورت میں دیکھ کر قدم اٹھانا چاہتے ہیں تو بہتر ہے کہ نہ اٹھائیں. اس طرح شریک ہونے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ شرکت کا نام کبھی ان کی زبان پر نہ آئے اگر کانگریس میں شریک ہونا چاہیے تو صرف اس لیے کہ انہیں اپنے اوپر بھروسہ ہے. اس لیے نہیں کہ دوسروں نے انہیں بھروسہ دلایا ہے، یا دوسرے انہیں بھروسہ دلاسکتے ہیں. اگر فی الحقیقت ان کی بے بسی اور بے چارگی اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ وہ سمجھتے ہیں خطروں اور تباہ حالیوں میں گھر گئے اور تحفظ کی راہ اس کے سوا کچھ نہ رہی کہ یا تو انگریزی اقتدار کے سہارے جئیں یا کانگریس کے اطمینان دلانے پر اور خود ان کے اندر خود اعتمادی و ہمت کی ایک چنگاری بھی نہیں رہی جو ان کی ٹھنڈی رگوں کو گرم کرسکے. تو میں کہوں گا کہ ایسی زندہ نعشوں کے لیے یہی بہتر ہے کہ جہاں پڑی ہیں، وہ نہ تو انگریزی اقتدار کی طرف دیکھیں نہ کانگریس کی طرف وہ خود داری کے ساتھ مستقبل کے فیصلہ کا انتظار کریں. یہ ان کی چودہ صدیوں کی تاریخ کا کم سے کم مطالبہ ہے جس سے ان کے کانوں کو بہرا نہیں ہونا چاہیئے.

واذا لم یکن من الموت بد،

فمن العار ان تکون جبانا

بلاشبہ میں آرزومند ہوں کہ مسلمان میدان میں اتریں، لیکن میں چاہتا ہوں

کہ انھیں اس طرح میدان میں دیکھوں جس طرح ایک بہادر اور بے خوف آدمی میدان
کا رخ کرتا ہے خود اعتمادی سے سر اٹھا ہو، عزم و یقین سے سینہ تنا ہو۔ وہ میدان کے
خطروں سے بے خبر نہیں ہوتا۔ یہ خطرے ہر طرف سے آ سکتے ہیں۔ مگر وہ جانتا ہے کہ خطروں
کے لیے اسے دوسروں کی طرف نہیں دیکھنا ہے، خود اپنی ہمت اور پامردی پر اعتماد کرنا
ہے۔ لیکن اگر وہ اس طرح میدان میں نہیں اتر سکتے۔ اور ساتھیوں سے شرطیں منوا لینے
کی فکر میں ہیں۔ تو بلا تامل اپنی ساری آرزوؤں سے دست بردار ہو جاؤں گا۔ میں یہ برداشت
کر لوں گا کہ وہ میدان میں نہ اتریں مگر اسے برداشت نہیں کر سکتا کہ ڈرتے ہوئے سہمے ہوئے
قدم اٹھائیں اس طرح ڈرتی ہوئی روح اور کھوئی ہوئی ہمت لے کر اگر وہ میدان میں
اتریں تو یہ زندگی اور عزت کا اقدام نہ ہوگا۔ بیچارگی اور نامرادی سے کسی کے پیچھے گھسٹنا
ہوگا۔ انھوں نے جونہی معاملہ کو اس شکل میں دیکھا کہ وہ خطروں میں گھر گئے ہیں۔ اور تحفظ
کی شرطیں منوا کر ہی قدم اٹھا سکتے ہیں تو پھر ان کی ہستی باقی نہیں رہی انھوں نے زندگی
اور کامرانی کی جگہ کھو دی۔ انھوں نے نامرادانہ مان لیا کہ وہ دوسروں کے رحم پر ہیں اور
یہی مان لینا ان کے لیے سم قاتل ہے۔ وہ کانگرس میں شریک نہیں ہونا چاہتے نہ ہوں، مگر
خدا کے لیے۔ یہ زہر کا پیالہ لبوں سے نہ لگائیں۔ یہ ان کے حلق سے نیچے اترا اور ان کے
دل کا ایک ایک ریشہ مردہ ہو گیا۔ دو حالتیں ہیں اور اس لیے حکم بھی دو ہونے چاہئیں
ایک بے عملی کا تعطل ہے ایک خود فراموشی کی موت ہے۔ اگر مسلمان کانگرس میں شریک
ہوئے تو یہ خود فراموشی کی موت ہوئی۔ تعطل آج نہیں کل دور ہو جائے گا۔ لیکن اگر
موت آ گئی تو اسے کون ٹال سکے گا؟ افسوس ان نادانوں کی سمجھ پر! یہ شاخوں اور
پتوں کے لیے روتے ہیں۔ اور ان کے حصول کا طریقہ یہ سمجھتے ہیں کہ جڑ پر آرا
چلاتے رہیں۔ حالانکہ نہیں جانتے شاخوں اور پتوں کا سارا کارخانہ جڑ کے
دم سے قائم رہتا ہے جب جڑ ہی نہ رہی تو شاخیں کہاں سے آئیں گی؟ پھول

پتے کس دن لگیں گے؟ یہ کہاں کی باغبانی ہے کہ پتوں کے عشق میں سرے سے جڑ ہی کا خاتمہ کردیا جائے آہ!

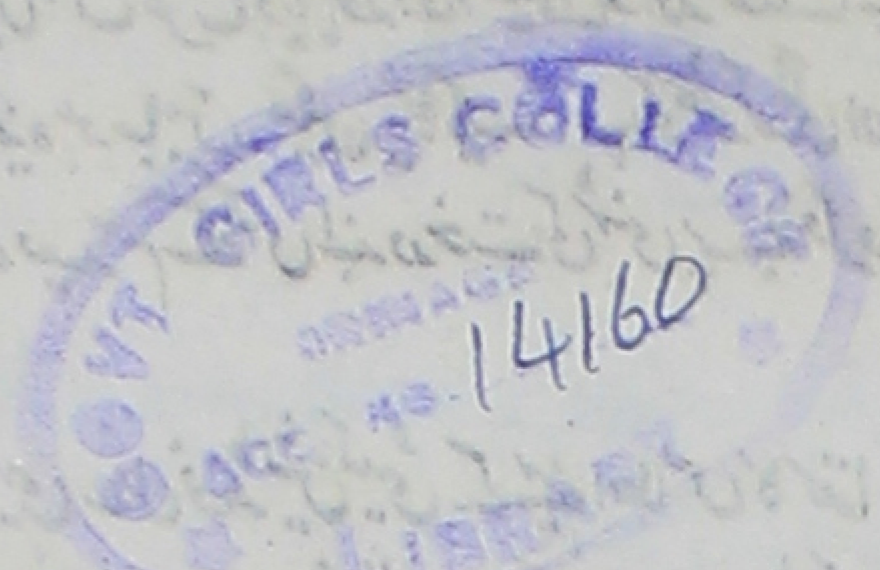
میر درد کا شعر کتنا پامال ہوچکا ہے پھر بھی اسے بھلایا نہیں جاسکتا۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ، تو نہ مرجائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

یہ کیا موت کے گھونٹ ہیں جو اعلانیہ مسلمانوں کو پلائے جارہے ہیں اور کوئی نہیں جو ان کا ہاتھ پکڑے، آخر بزدلی اور ہمت فروشی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیئے۔ آٹھ کروڑ انسانوں کی شکن آلود پیشانیوں پر آج بھی چودہ صدیوں کی تاریخ کے مدھم حروف پڑھے جاسکتے ہیں، یہ یقین دلانا کہ وہ مرگئے، تباہ ہوگئے اور اس قابل بھی نہ رہے کہ مستقبل میں اپنے مفاد کی حفاظت کرسکیں، یقیناً ان کی خودداری، اور خود اعتمادی کے سارے احساسات کو یک قلم قتل کر ڈالنا ہے۔ اور اگر ایک جماعت ان احساسات سے محروم ہوگئی ہے تو پھر حقوق کے پروانے اور تحفظات کے ٹھپے اسے کیا کام دیں گے۔ افراد کی طرح جماعتوں کی زندگی بھی روح سے ہوتی ہے، روح اگر موجود ہے تو سب کچھ ہے، روح اگر نکل گئی تو سب کچھ جاتا رہا۔ جسم جماعت کے لیے یہ روح کیا ہے؟ جماعتی شرف و عزت کا احساس، خود اعتمادی کا یقین، عزت و ہمت کا ولولہ، سعی و عمل پر اعتماد، جس جماعت میں یہ روح موجود ہے۔ وہ زندہ ہے وہ زندگی کے تمام لوازم حاصل کرکے ہی رہے گی، جس جماعت نے یہ روح کھودی وہ مردہ ہوگئی۔ اور مردے کے چاروں طرف قیمتی تعداؤں کے کتنے ہی خزانے جمع کردو وہ زندہ نہیں ہوجائے گا۔

ڈاکٹر۔ امبیدکار نے اچھوتوں کی جنس کس فخر سے ہندوستان کے پاس رکھ دی جو زیادہ بول بول سکے، آگے بڑھے اور خریدلے، کیا مسلمان چاہتے ہیں:۔ وہ بھی سیاست کی ایک ایسی ہی جنس بن کر رہ جائیں، جو ہمارے جی کا فنڈ نکال دے

ہمیں خرید لے؟ اس بازار میں انھوں نے کبھی قوموں کی قسمتیں خریدی تھیں۔ اگر آج اس قابل نہیں رہے کہ دوسروں کی متاع ہمت خرید سکیں۔ تو کم از کم خود اپنی ہمت تو اس ارزانی کے ساتھ فروخت کرتے نہ پھریں۔



حدیث الغاشیہ

مرغ اسیر کی گرفتاری اور صیاد بے مہر کی تغافل شعاری کا مرثیہ ہمارے شعرا کی بدولت ایک عجیب و غریب دلچسپ داستان بن گئی ہے۔ فرض کیجیے کوئی خوش لحن طائر اپنے ہزار دل آرزوؤں اور تمناؤں سے پامال ہو اور اس کا مسنونہ ضعیف آپ کی مضبوط مٹھی میں اس طرح دبا ہو کہ ذرا انگلیوں کو اور سخت کیجیے تو غریب کی کاغذی پسلیاں ریزہ ریزہ ہو جائیں۔ لیکن یکایک آپ کو ٹھوکر لگی اور اب جو دیکھتے ہیں تو ہاتھ خالی ہے اور وہ صید ستم کسی بلند درخت کی ٹہنی پر بے فکر و بے پروا بیٹھا ہوا چہچہا رہا ہے۔

بعینہ یہی سال فونڈیشن کمیٹی کے پہلے اجلاس کا تھا۔ وہ صیادان سخت پنجہ جنہوں نے قومی آزادی اور جماعتی رائے کی سنہری چڑیا کو برسوں اپنی آہنی انگلیوں میں دبا کر مقید کر رکھا ہے اور استبداد گورنمنٹ کا یہ حال تھا کہ اف کرنے کی بھی اجازت نہ تھی اب چشم تر اور نگاہ خونبار سے دیکھ رہے تھے کہ ایک جست میں برق رفتار ان کے قبضے سے نکل گئی اور وہ ہاتھ جو کل تک کسی کے پر و بال مقیدہ سے بھرے ہوئے تھے اب خالی ہیں تاکہ جی بھر کے اپنی محرومی اور بے بسی پر ماتم کریں۔

بہر حال انقلاب حال نے لیڈروں کے کیمپ میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ پچھلی جنگ کی ہزیمت سامنے تھی اور آئندہ کی خوفناک ہزیمتوں کے سامنے اس لیڈری کے سومنات کا ہیبت لرزاں و ترساں تھا۔ تاہم ایک رات درمیان میں باقی تھی اور جو کچھ ہونا تھا ضرور تھا کہ طلوع آفتاب کی روشنی سے پہلے ہی انجام پا جائے۔

پس جب سومنات کے چھوٹے طبقوں نے دیکھا کہ ہمارا عمل السحر یہ کچھ کام نہیں دیتا تو........ ان میں جو سب سے بہتر آدمی تھا کہنے لگا کہ کیا میں تم سے نہیں کہا کرتا تھا کہ اپنے اس آخری معبود ہی کی تسبیح و تقدیس کیوں نہیں کرتے (جو تمام مشکلوں کو حل کرنے والا ہے (۶۸ : ۱۸)

پھر کیا تم نے "لات" اور "عزیٰ" نامی بتوں کو نہیں دیکھا ہے اور وہ جو ایک سب سے بڑا تیسرا بت اور جس کا نام "منات" ہے۔

دعا مستجاب ہوئی اور بالآخر اعمال واشغال مخفیہ کی یہ عظیم الشان رات اس طرح شروع ہوئی کہ سب سے پہلے اس مقدس عمل تسخیر کو انجام دیا گیا جس کا ظاہری و سادہ نام لوگوں کی زبان میں "ڈنر" ہے۔



راویان صداقت شعار اور ناقلان عدالت آثار روایت کرتے ہیں کہ یہ عمل ساڑھے بارہ بجے تک بجمیع شرائط جاری رہا ہے

اور جو کچھ ہوا قابل اظہار نہیں

"تسخیر کواکب" کے عمل کی مشکلات آپ کو یا مجھ کو کیا معلوم، ان سے پوچھیے جنہوں نے اس فن کے علم و عمل دونوں میں دستگاہیں حاصل کی ہیں۔ پھر مقصد جیسا کہ اہم ہوتا ہے اتنا ہی عمل بھی قوی ہوتا ہے۔ اس عمل میں بڑی مشکل یہ تھی کہ قرون السعدین نہیں بلکہ قران الضدین "کا سامنا کرنا تھا۔ مریخ اور زہرہ دونوں کو جمع کرنا تھا اور مشتری کے گرد حلقہ کھینچنا تھا کہ "زحل" کے فرمان سے باہر قدم نہ نکالے بہر حال عامل کا پنجہ سخت تھا، مریخ اور زہرہ سے بہ ایں ہمہ ناز و عشوہ وعدہ لے لیا گیا کہ عین حضرت مریخ کے سامنے اپنا رقص ہوش افگن نظارگیاں ارض کو دکھلائے گی۔

اس صحبت فلکی میں تو یہ عجائب و غرائب انجام پا رہے تھے اور ادھر زمین کے

بسنے والوں کی قسمت سر پیٹ رہی تھی۔

بگذاز سعادت و نحوست مرا
ناہید بغمزہ کشت و مریخ بہ قہر

اصل یہ ہے کہ پہلے اجلاس میں جن بعض زبان آوران آزادی نے سرگرم تقریریں کی تھیں ان کی نسبت لیڈروں نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ ابھی اس سنہری ٹکڑوں کے لئے آزمائش باقی ہے۔

۲۶ر دسمبر کے جلسہ میں جب کہ لفظوں کی جگہ زبانوں سے شعلے نکل رہے تھے تو راجہ صاحب محمود آباد ہمارے مجلس طراز دوست مسٹر محمد علی کو مخاطب کر کے دل ہی دل میں ضرور کہتے ہوں گے۔

مجلس طرازیوں کے چکھا دوں گا سب مزے
تم اتفاق سے کہیں تنہا اگر ملے؛

بالآخر انتظار میں زیادہ دیر نہیں لگی اور بہت جلد تنہائی کا گوشہ خلوت ہاتھ آگیا خلوت کے اسرار دنیاز محرمان مجلس تک تو پہنچتے نہیں ہم ایسے غیروں کو کیا خبر تاہم یہاں تک تو تمام راوی متفق ہیں کہ راجہ صاحب نے اپنی شکست کا اعتراف کیا اور کہا اگر ہرانا ہی چاہتے ہو تو ہارے جانے کا اقرار کرتے ہیں اب اور اب کیا چاہتے ہو؟

اسیر اندا ختیم اگر جنگ است

کہا جاتا ہے کہ راجہ صاحب نے کہا تھا کہ جب تک مسٹر محمد علی رام نہ کیے جائیں گے کچھ نہیں ہوگا یہی سبب ہے کہ اسی خلوت شب کی بارات کا دولھا الکیر کو بنایا گیا اور رات بھر سہرے کی آرائش و زینت میں صرف ہوئی۔ خیر ہم کو اس سے کوئی بحث نہیں تو ہم تو صبح کی چشم خمار آلود اور زلف پریشان کی ادائیں دیکھنے والوں میں تھے اور یہ جو اپنے حصہ میں آیا تو اس پر شاکی نہیں ہمارے دوست کے ہم وطن یوسف علی خاں

ناظم کا فلسفہ اس موقع کے لیے نہیں یاد تھا ؎

ادائیں شب کی تو سب لوگ دیکھتے ہیں مگر
ہم ان کی بگڑی ادائیں سحر کو دیکھتے ہیں

یہ تو شب وصل کی شام تھی اس کے ذکر کو کہیں جلد ہٹایئے کیونکہ اصل پر لطف حصہ تو اس کے بعد آتا ہے جب کہ رندانِ بادہ گسار نے "حجلۂ نیم قصبی" آراستہ کیا اور موٹر کار پیچھے کھینچ کر ایک شریکِ پیمان کی قسمت خفتہ کو خردہ بادہ گساری سے بیدار کیا گیا۔

وقت آں نیست کہ بہ حجرہ بخوابی تنہا

چشم تصور سے کام لیجئے کہ دسمبر کی آخری ہفتہ کی سرد راتیں ہیں۔ لیلائے شب کی زلف کمر سے گذر چکی ہے، ایک کنج خلوت میں صحبت بادہ پرستی گرم ہے اور گرم گرم سازشوں کی۔

دھری شراب ہے بیٹھے ہیں بے حجابا ساقی

قبل اس کے کہ آپ کسی مدعی زہد کا الزام دیکر آپ ہی کو منصف بناتے ہیں۔ کہ بھلا ایسی توبہ شکن اور دلولہ انگیز صحبت میں اگر ہمارے کسی دوست کی توبہ نے لغزش کھائی اور اس بام زہد فروش کو منہ سے لگانے ہی بنی۔ جو کسی کے دست طلائی لے پیش کیا گیا تھا۔ انصاف کیجئے کہ آخر پہلو میں دل کس کے نہیں ہے، اور پھر یہ تو وہ مقام ہے کہ "ھاذ وت وھاد ون" کے قدم بھی لڑکھڑا گئے تھے ؎

ساقیا رنج از من عالم جوابہا ست

خود محبت آزمایانِ شبینہ کا بیان ہے کہ بادہ گساری رات کے دو بجے تک جاری رہی- اللہ اللہ جاڑے کی راتیں اور پچھلے پہر کی پراسرار صحبتیں، آپ الزام و اعتراض کی فکر میں ہیں اور "رات کے دو بجے" کے لفظ سے نہیں معلوم کیسے

کیسے خیالات میرے دماغ میں گزر رہے ہیں۔ رات کی تاریکی، پچھلا پہر، رندانِ شاطر و کہنہ مشق کا ہجوم اور بعض نوجوان ولو آموز مدعیان حمیت، پھر شغل مے پرستی کا یہ عالم اب کیا کہوں کہ کیا کہنا چاہتا ہوں۔

مست بر بستر من افتد زنان دانند
حالتے مستمند کہ بہ بستر ہشیار افتد

اب ادھر کی سنیے۔ یہاں تو شب زندہ دارانِ بادہ "گساری" صبح خمار کی عفسار نشکینوں میں کروٹیں بدل رہے تھے اور ادھر صبح آٹھ بجے ہی سے اجلاس، اجلاس کا ہال تماشائیانِ بزم سے بھر گیا۔ ایک دن پہلے حصول مقصد کے لیے جو تدابیر گوناں گوں و بوقلموں اختیار کی گئی تھیں من جملہ ان کے ایک تدبیر خاص یہ تھی کہ جلسے کے لیے ٹکٹ مقرر کر دیا گیا اور یہاں تک ہمیں بھی اتفاق تھا کیونکہ آج اسٹیج پر "پسند" سے جو تیلیاں نکلنے والی تھیں، وہ تھیٹر کے آموختہ یاد کیے ہوئے ایکٹروں کی طرح ایک تماشے سے زیادہ نہ تھیں اس کے ساتھ ہی ٹکٹ کے لیے تھیٹر کے دروازے پر ٹکٹ گھر کی کھڑکی کا اعلان کیا گیا تھا، لیکن جو لوگ وہاں پہنچتے تھے ان سے کہا جاتا تھا کہ راجہ صاحب کے ہاں جائیے راجہ صاحب کے ہاں سے دوبارہ ہدایت ملتی تھی کہ جہاں سے آئے ہیں اسی طرف چلیے پاؤں پڑتے

یاں سے واں، واں سے یاں حکم ہوا وصل کی شب
ہم اٹھاتے ہی بچھاتے پھرے بستر اپنا

حالانکہ یہ سب انتظامات فضول تھے کیونکہ رات کے قول و قرار کے بعد سب مطمئن ہو گئے تھے کہ جب خیموں میں باہم صلح کر لی ہے تو میدان جنگ میں لڑائی کا اب کیا خوف! ناظم پاشا جب ساتھ ہو گیا تو کامل پاشا بے فکر ہو گیا وہ جانتا تھا کہ فوج کی اصلی قوت اسکے ہاتھ میں ہے غرضیکہ آٹھ بجے سے جلسہ منعقد درسہ احبابِ حل و عقد کا منتظر تھا لیکن کسی بزرگ کا پتہ نہیں اور پتے کی بات کیونکر جس جنگ کے لیے یہاں فوج آئی تھی اس کی صلح رات کے دو بجے کی تاریکی میں

انجام پا چکی تھی۔ بہرحال ادھر رونمائی میں دیر ادھر مشتاق دید کی بے صبری عجب کشمکش تھی۔

ہوتا ہے اثر وہام تمنا اسی قدر
ہوتی ہے جتنی دیر کشو دنقاب میں

خدا خدا کر کے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں بطور "مقدمۃ الجیش" کے تشریف لائے گو خود ان کا آنا "جلوہ یوسفی" نہ تھا۔ لیکن اپنے ساتھ "نسیم پیراہن" کی بشارت ضرور رکھتا تھا۔ انھوں نے سب سے پہلے صحبت نیم باشی کا اعلان کیا اور "جنگل میں منادی کرنیوالے یوحنا" کی طرح خبر دی کہ "راہ صاف کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہت" اب قریب ہے یہاں تک دس بجے صدہائے منتظرہ اور صدہائے مضطرب کی صفوں سے گذرتی ہوئی ارباب حل وعقد کی قطار جلوہ فروش ہوئی اور حجلہ سازش کے تمام عروسانِ شب زندہ دار ایک ایک کر کے لنظر نواز بزم و انجمن ہوئے۔ چہروں نے پہلی ہی نظر میں رمز فروشی کی کہ رات بھر میں رنگ بدل چکے ہیں ؎

شب تو شراب خوردہ بالو صد نشانہاست

انہیں میں ہمارے شیوہ طراز دوست مسٹر محمد علی بھی تھے صحبت نیم شبی کا خمار آنکھوں میں اور شب بیداری کی فسردگی چہرے پر جی میں آیا بڑھ کے پوچھیں ؎

تو شبانہ می نمائی بہ بر کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد

لیکن ہمارے دوست نے اپنی ایک رات کی حریف پر دماغی سے دوسرے دن کا ایسا احصار ہجوم پیدا کر لیا تھا کہ اب اس کا موقع ہی کب باقی رہا تھا ؎

جو کام میں غیر کے ہوئیں صرف — افسوس وہ دلربا ادائیں

دراصل فونڈیشن کمیٹی کی تمام بحث اسی پر آکر ختم ہو گئی تھی کہ ڈاکٹر میجر سید حسن

بلگرامی کا ریزولیشن منظور ہو یا نا منظور تمام دیگر مسائل طے پا چکے تھے اور اصل جھگڑا جو ارباب کار کو حصول یونیورسٹی کی راہ میں نظر آتا تھا اب یہی ریزولیوشن تھا یعنی گورنمنٹ کے اختیارات کا مسئلہ۔ ریزولیشن کے الفاظ یہ تھے :-

"قوانین کالج کی دفعہ ۱۲ کے ضمن میں جو اختیارات اس وقت پیٹرن کو حاصل ہیں ان سے زیادہ اختیارات یونیورسٹی کی صورت میں حضور" والسرائے کو بحیثیت چانسلر نہ دیئے جائیں۔"

میجر صاحب نے اس تجویز کو بعد از ہزار سعی و مجاہدات پیش کیا اور تمام آزاد خیال طبقہ نے ساتھ دیا اور آخر تک ساتھ دینے کے لیے تیار تھا، لیکن اب جو وہ تشریف لائے تو اسٹیج پر آتے ہی میں نے ان سے پوچھا فرمایئے کیا ارادہ ہے، کہا صلح کاری کے ساتھ کام کرنا بہتر ہے مجھ کو یقین ہے کہ بحالت موجودہ میرا ریزولیشن پاس نہیں ہو سکتا۔ میں نے اسی وقت انا للّٰہ پڑھ دیا کہ گو تمام "یورپین ٹرکی" ہاتھ سے جائے مگر "صلح" رہے۔

میجر صاحب کانفرنس کی صدارت کے لیے تشریف لائے تھے اور فی الحقیقت جس قابلیت اور سعادت کے ساتھ انہوں نے اپنے فرض کو ادا کیا وہ ان کی عظمت کے لیے بہت بڑی چیز ہے، پس بہتر تھا کہ فونڈیشن کمیٹی کے اجلاس میں حصہ نہ لیتے اور اس ریزولیوشن کو پیش ہی نہ کرتے، وہ نئے نئے قوم کے سامنے آئے اور آتے ہی اپنے تئیں ایک آزمائش میں ڈال دیا حالانکہ آزمائش کی راہ دوسری ہے۔

عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد

ہم ایک شعر یاد کرنے لگے جس کا پہلا مصرع یاد نہیں آتا دوسرا مصرع یہ ہے۔

اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمے ماند

بہرحال مجلس جم چکی تو پردہ اٹھا اور اس تماشہ کا ایک ہی ایکٹ شروع ہوگیا۔ سب سے پہلے عشوہ فرما دوست مسٹر محمد علی باہر نکلے اور ریزولیوشن پیش کیا۔ وہ بیٹھے تو میجر سید حسن بلگرامی اٹھے اور تائید کی۔

یکے بہ روئے دلے رفت و پردہ دار یکے

اب نہ ۲۶ کے محرک تھے نہ مؤید:

یہ لوگ بھی غضب ہیں کہ دل پر یہ اختیار
شب موم کر لیا، سحر آہن بنالیا

غرضیکہ دو دن کی فریقانہ معرکہ آرائی کو اب اور کہاں تک طول دیا جاتا، اس کا فیصلہ یوں کیا گیا کہ بین بین طریقہ پسند کیجیے کہ خیر الامور اوسطہا۔ کفر و اسلام دونوں کو اختیار کیجیے۔ اہرمن اور یزداں کو رام کیجیے صرف کعبہ کی طرف کیوں ہو رہیے جب بتکدے سے بھی رسم و راہ رہ سکے ایک ہاتھ میں زنار برہمن لیجیے اور دوسرے ہاتھ میں سبحۂ زاہد

؎ معشوق ما بشیوۂ ہر کس موافق است
با ما شراب خورد و بہ زاہد نماز کرد



میجر صاحب کی تائید کے بعد میں نے تقریر کرنا چاہی لیکن خواجہ غلام الثقلین صاحب نے کہا کہ وہ ریزولیوشن کی نسبت ایک ترمیم قلمبند کر چکے ہیں اس کو پیش کریں گے۔ چنانچہ خواجہ صاحب نے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ تقریر کی اور دانشمندانہ طریقے سے بعض اختیارات مہمہ کے محفوظ رکھنے

کی ضرورت واضح کی لیکن انتظامات مخفیہ سرگرم کار تھے۔ مخالفت کی آوازیں اٹھنا شروع ہوگئیں۔

اس عرصہ میں میں سوچ رہا تھا۔ تمام قیاسات کی تصدیق ہو چکی تھی اور معلوم ہو گیا تھا کہ آزاد خیال پارٹی کی قوت کو شکست دینے کیلئے ایک "عنصر" مرکب سے الگ کر لیا گیا ہے۔ ایک جال ہے جس میں سب کے پاؤں پھنس گئے ہیں۔ پھر کیا رنگ بدلا ہوا دیکھ کر میں بھی خاموش ہو جاؤں۔ یہ ایک بڑی ہر دلعزیزی اور احسان مندی تھی جو بغیر کسی نقصان کے حاصل ہو تی تھی۔ یہ خیال تھا جو اس وقت معاً ہر دماغ میں گزر سکتا تھا۔ لیکن گو قوت کا ایک لمحہ کے لئے بھی دعویٰ نہیں تاہم ایسے ایسے وساوس شیطانیہ کے لئے تو الحمدللہ اپنے پہلو میں ایک قوت رکھتا ہوں۔ ہر دلعزیزی کی خواہش ایک وسوسۂ شیطان ہے جس کی ایک نگاہ کرم کے ساتھ ہی ہمتوں اور استقامتوں کی بڑی بڑی چٹانیں پانی ہو کر بہہ جاتی ہیں لیکن جس دن میں نے اپنی پہلی آواز بلند کی اس دن سے اپنے پاؤں کو راہ حق گوئی کی اس اولین زنجیر سے آزاد کر لیا تھا اور استقامت کی توفیق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

میرے عقیدے میں ہر دلعزیز کا زیادہ صحیح نام "منافق" ہے۔ یہ محال قطعی ہے کہ ایک شخص "حق گو" ہو اور پھر بزم کفر و ایماں دونوں میں ہر دلعزیز ہو۔ یہ بالکل فضول کوشش ہے کہ دونوں میں سے کوئی نئی "درمیانی" راہ پیدا کی جائے۔

میں نے تو ارادہ کر لیا ہے کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو لیکن اپنے ظاہر و باطن کو ایک رکھوں گا اور جو دل میں ہوگا اس کو زبان کے حوالے کروں گا۔ دعا کرتا ہوں کہ خدا مجھے جلد کسی سخت آزمائش میں ڈالے۔

مجھ کو بعض صاحبوں نے روکا کہ اب مخالفت میں تقریر کرنا بے فائدہ ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ان بزرگوں کی غلطی تھی۔ مخالفت اس لئے نہیں کی جاتی کہ موافقت کی صدائیں بلند ہوں بلکہ صرف اس لئے کی جاتی ہے کہ ایمان اور ضمیر کا حکم ہے یہ حکم بالکل اس سے بے پرواہ ہے کہ لوگوں کا کیا خیال ہے۔ کوئی سچی بات اس لئے نہیں ترک کر دی جاسکتی کہ لوگ اس کا استقبال نہیں کریں گے۔ سچ سچ ہے اگرچہ تمام عالم میں ایک بھی اس کا دوست نہ ہو۔

حریف کاوشِ مژگان خوں ریزش نئی ناصح
بدست آور رگ جانے و نشتر را تماشا کن

جلسہ میں اس وقت تین طرح کے لوگ تھے۔ مجلس نیم شبی کے محرمانِ راز ان کے متبعین جو خود ارباب صحبت نہ تھے مگر ان کے نام احکام جاری ہو گئے تھے اور کچھ عام لوگ جو اس ناگہانی انقلاب سے بالکل بے خبر تھے اور کوئی آواز اور رائے نہ رکھتے تھے۔ ان میں بہت سے تعلیم یافتہ اور بہت سے سرگرم مدعیان آزادی و حریت تھے۔ مگر یہ سب اسی تیغ تیز سے زخمی ہوئے کہ مسٹر محمد علی کو تحریک کرتے دیکھا! وہی کمبخت مذاق تقلید جو کل تک پرانے لیڈروں کی اندھا دھند اتباع کی صورت میں خانماں سوز عقل و دانش تھا۔ آج آزادی کے عہد تازہ میں نئے لوگوں کے اتباع کی صورت میں فہم و درایت کی گردن کا طوق بنا۔ درد و ندامت کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ابناء عصر کی غلامی بھی مقلدانہ تھی اور اب آزادی مقلدانہ ہے۔

اب قدیم و جدید اور مستبدین واحرار کی "متحدہ سازش" سخت بدحواس ہوئی کہ کہیں بنا بنایا کھیل نہ بگڑ جائے۔ ہر طرف سرگوشیاں شروع ہو گئیں۔ معاً خواجہ غلام الثقلین کو بھی ڈیپوٹیشن میں شریک کر لیا گیا۔ ان کا بیان ہے کہ مجھے

اسٹیج کے "اقصائے مغرب" سے "مشرق ادنیٰ" کی طرف کھینچ کر لے گئے۔ وہاں قسمیں کھاکر اطمینان دلایا اور منتیں کیں کہ مان جاؤ۔ کیا کرتا مجبوراً ماننا ہی پڑا۔

گو مے ہے تند و تلخ پہ ساقی ہے دلربا
اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کئے بغیر

خواجہ صاحب کہتے ہیں کہ جب معاملہ یہاں تک پہنچا تو میں نے مناسب نہ سمجھا کہ اور زیادہ مخالفت کروں۔ عرصہ کے بعد کانفرنس میں آیا تھا۔ لوگ کہتے کہ اس نے چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دیا۔ بہرحال یاران طریقت نے خواجہ صاحب کو بھی چپ کرا ہی دیا۔

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا، نگہ التفات ہے

اب خواجہ صاحب کیا شکوہ کریں وہ کہتے ہیں کہ مجھے قسموں نے فرصت ہی نہ دی۔

ناز سے عشوہ سے غمزہ سے لگا لیتے ہیں
وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں

خواجہ صاحب نے بھی دیکھا کہ کسی کی منتیں مفت ہاتھ آتی ہیں۔ یہ ضد اور ہٹ کا موقع نہیں۔!

بڑا مزہ ہو جو محشر میں ہم کریں شکوہ
وہ منتوں سے کہیں چپ رہو خدا کے لئے

لے دے کے اک خواجہ صاحب ہمارے ساتھ اٹھے تھے ان کو بھی ہمارے دوست اسٹیج کے پیچھے لے گئے۔ بے چارے میر حسن کو بھی یہی شکایت تھی۔

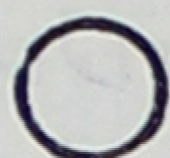
جو کوئی آئے ہے نزدیک ہی بیٹھے ہے تیرے
ہم کہاں تک تیرے پہلو سے سرکتے جائیں

ہم تو اس وقت تقریر کر رہے تھے۔ کسے معلوم کہ اسٹیج کے گوشوں میں کیا ہو رہا ہے۔ ورنہ خواجہ صاحب کو پہلے ہی خبردار کر دیتے۔

لغزش نہ ہو بلا ہے حسینوں کا التفات
اے دل سنبھل وہ دشمن جاں مہرباں ہے اب

خیر بہتر ہے دنیا کو یہ عقل مندی اور مجھ کو اپنا جنون مبارک رہے۔

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا



غرضیکہ کہاں تک اسی افسانے کو طول دیجئے۔ زلف یار کی آج تک کوئی پیمائش کر سکا ہے۔

ماجراہاست بہ آں زلف جنوں ساز مرا

بالآخر وہی ہوا جس کا ہزاروں تمناؤں اور آرزوؤں کیساتھ انتظام کیا گیا تھا۔

یاں لعل جنوں ساز نے باتوں میں لگایا
دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

یاران کار فرما پر ایک ایک منٹ ایک ایک برس کا گزر رہا تھا جلدی بھی، کہ نہیں معلوم کن کن اعمال مخفیہ اور وظائف "نصف اللیل" کے بعد اپنا بخت خفتہ بیدار ہوا ہے اور لوگوں کی آنکھوں پر غنودگی طاری ہوئی ہے

کہیں ایسا نہ ہو کہ ادھر ان کی آنکھ کھلے اور ادھر اپنی قسمت پھر چادر منہ پر ڈال لے بہ ہزار مشکل ان کو نہایت نپا تلا وقت ... دیا گیا تھا۔ لیکن ادھر ایک لفظ منہ سے نکلتا تھا اور ادھر گھڑی دکھائی جاتی تھی کہ وقت ہو گیا ؎

اس کی محفل کی دیکھنا تہذیب

بات کا انتظام ہوتا ہے

یکایک غل مچا کہ ریزولیوشن پاس کر دو۔ راجہ صاحب نے حضار مجلس سے پوچھا منظور ہے ؟

این سخن راچہ جواب است تو ہم می دانی

بھلا یہ کبھی کوئی پوچھنے کی بات تھی۔

اگر حلقہ نیم بسمی کا بس چلتا تو اس سوال کا جواب زبان کی جگہ دل کے ٹکڑوں کی پیش کش سے دیتے۔

ساقی مے دے کہ اہل محفل

پانی پانی پکارتے ہیں

یکایک شور اٹھا کہ منظور ! منظور !! منظور !!!



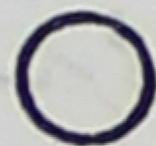
ریزولیوشن کے پاس کر دینے کی خوشی کے ہیجان نے ہوش و حواس کھو دیئے تھے۔ جن نوجوانوں نے برسوں اپنی گلے بازی سرگرم تقریروں میں دکھلائی تھی آج ان کی گرج اس ہنگامے کے بپا کرنے میں کام آگئی۔ چیختے چیختے گلا بیٹھا جاتا تھا۔ مگر سینوں کے اندر آوازوں کا ایک سمندر بہہ رہا تھا۔ آوازا گلتے اگلتے منہ دکھے جاتے تھے مگر برق و رعد کا سیلاب تھا کہ

کسی طرح بند ہی نہیں ہوتا تھا۔ بلغاری محاصرہ کی پلٹنیں اپنی بیکاری سے کچھ اکتاسی گئی تھیں۔ اب انھوں نے ایک گھنٹہ کی خاموشی کی کسر یوں نکالی کہ کچھ دیر کے لئے بارہ دری کے اسٹیج کو "پامسٹن سرکس" کا تماشا گاہ فرض کرلیا اور لگے بے تان قلابازیاں کھانے۔

دل از تمکیں شود بے ذوق زنہار
گہے طفلے شود مستانہ می رقص

جن لوگوں نے ان عجیب وغریب گھڑیوں کو نہیں دیکھا ہے محال ہے کہ انہیں اس کی کیفیت سمجھائی جاسکے۔ چہرے جوش وہیجان سے سرخ، گردن کی رگیں ابھری ہوئی، گلے شدت ہنگامہ سے پڑے ہوئے، ہاتھ میں اچھلتی ہوئی ٹوپیاں اور پاؤں میں اضطراب رقص۔ منہ سے کف اڑ رہا تھا اور چونکہ قریب کھڑے تھے اس لئے آپس ہی میں ایک دوسرے کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔ رومال نکال کر منہ پونچھتے اور پھر کف اڑاتے۔

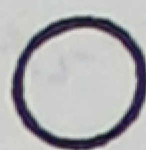
منتظمین جلسہ کو کیا معلوم تھا کہ بارہ دری کی اسٹیج سے میدان رقص کا کام لیا جائے گا۔ ورنہ اس کی رعایت ملحوظ رکھتے۔ نتیجہ یہ تھا کہ جوش تواجد میں گردش رقص کی جگہ نہیں ملتی تھی اس لئے جو رقاص جہاں کھڑا تھا وہیں اپنے پاؤں سے اسٹیج کے چوبیں تختوں کو کوٹ رہا تھا۔



لیکن اس عجیب نظارے کا ایک منظر تو رہ ہی گیا۔ جونہی ریزولیوشن کے پاس ہونے کا غل مچا، ہم نے دیکھا کہ معاً راجہ صاحب محمود آباد اپنی کرسی سے مضطربانہ اٹھے اور نواب وقار الملک بہادر کے ہاتھوں کو بے

اختیارانہ چوم لینا چاہا۔

نواب صاحب قبلہ کی جو سچی عظمت قوم کے دل میں ہے اس کے لحاظ سے اگر راجہ صاحب ان کے قدم بھی چوم لیتے تو یہ کوئی بڑی بات نہ تھی لیکن ریزولیوشن کے پاس ہونے کے ساتھ ہی اس مضطربانہ اور بیخودانہ تعظیم کا مطلب ہم نہ سمجھے۔ لیکن بعد کو معلوم ہوا کہ دست بوسی کی یہ قیمت نقد متاع "خاموشی" کے انعام میں تھی۔ یہ مضطربانہ اظہار تعظیم وتکریم اس لئے تھا کہ وہ اگر اس وقت خاموش نہ رہتے تو یہ کشتی طوفانی ساحل مراد تک نہ پہنچتی۔



حریفان خلوت نے "صحبت نیم شبی" کے مزے لوٹے۔ لیکن اس بادہ گسارانہ فیاضی کا اعتراف کرنا چاہیئے کہ صبح کی مجلس عام کو بھی سرشاری بے خودی سے محروم نہ رکھا ؎

بے خود اس دور میں ہیں سب حاتم
ان دنوں کیا شراب سستی ہے

لیکن ہم کہیں کہہ چکے ہیں کہ ہمارے ساقی مآب دوست نے پلائی تو ضرور کوئی ایسی ہی شے جس کا رنگ سرخی مائل اور نظروں کے لئے ولولہ انگیز تھا۔ لیکن اس میں شک ہے کہ کہیں پانی تو زیادہ نہیں ملا دیا تھا۔ کیونکہ ہم نے خود دیکھا کہ شام ہوتے ہوتے جمائیاں آنی شروع ہو گئی تھیں اور چہرے اکثر بے حال تھے۔

بارہ درّی سے نکلتے کے بعد ہی چند مدعیان آزادی ملے جن

سے ہم نے پوچھا کہ یہ کیا ہنگامہ تھا تو وہ ریزولیوشن کا مطلب بھی نہ سمجھا سکے جب کہا کہ بے سمجھے بوجھے آپ نے ہی تو رقص مغلوبہ میں حصہ لیا تھا تو نکا یک ان کے سر میں خارش شروع ہو گئی۔ حالانکہ اب ہاتھ کی جگہ سر نہیں پیشانی تھی۔

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

وہاں تو سب دم بخود رہے لیکن ڈیپوٹیشن کی شرکت کا مسئلہ ایسا نہ تھا جو بعد کو یاد نہ آتا۔ ہم نے سنا ہے کہ بقیہ تمام دن اس معرکہ آرائی میں صرف ہوا۔

بہ بعد از انفصال اب اور ہی جھگڑا نکل آیا

بزرگان پنجاب نے فوراً اپنا بستر لپیٹا کہ ہماری قائم مقامی کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ گویا اور تمام صوبوں کی قائم مقامی کا کامل لحاظ رکھا گیا تھا سنا ہے کہ جناب راجہ صاحب اسٹیشن پر دوڑے ہوئے گئے، کہ خدا کے لئے اور جو جی میں آئے کیجئے مگر روٹھ کر تو نہ جائیے۔

تم ہی سچے سہی اس بات کا جھگڑا کیا ہے

اور دلوں پر کچھ اس طرح قبضہ کر لیا کہ روٹھوں کو منا ہی نہیں لیا، بلکہ دو ممبر اور بڑھا لئے۔

رنجیدہ می روی ز سر کوئے او سلیم
چوں مے شود نیاید اگر از قفا کسے

زندہ دلوں کا وطن

یہ مانا کہ کسی ملک کی آب و ہوا جسم انسانی کے لئے خاص اثر رکھتی ہو مگر یہ تو کچھ ضرور نہیں کہ ایک سرزمین کا اخلاق بگڑنے پر آئے تو پورے خطے کی حالت یکساں بگڑ جائے۔

ہم عرصے سے دیکھ رہے ہیں کہ پنجاب کے اخبارات گو خریداروں کے پیدا کر لینے اور نئے نئے کارخانوں کے چلا لینے میں ترقی کر رہے ہیں مگر ان کا اخلاقی تنزل نہایت دردانگیز ہے۔ کل کی بات ہے کہ زمیندار اور وطن میں جوتی پیزار ہو رہی تھی، اور جس طرح پنجاب میں پہلوانوں کے دنگل ہوا کرتے ہیں، اسی طرح دونوں پہلوان ایک دوسرے سے گتھے ہوئے تھے۔ زمیندار کا صرف یہ قصور تھا کہ تھوڑے دنوں کے اندر ہی اس کی اشاعت پرانے اخباروں سے کیوں بڑھ گئی۔ اور کیوں وہ لاہور کے چند دولت مندوں کی پرستش سے انکار کرتا ہے؟ انسان کے تمام قصور معاف ہو سکتے ہیں مگر ایک دوکاندار اس شخص کو تو کبھی معاف نہیں کر سکتا، جس نے اس کے سامنے کی جگہ کو خالی دوکان پر قبضہ کر کے راہ کے خریداروں کو اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔

ہمارے عقیدے میں یہ نتائج صرف اس بات کے ہیں کہ پنجاب

میں تجارت کی ترقی نے بالعموم دوکاندارانہ اخلاق پیدا کر دیا ہے اور اغراض پرستی کی ہوا میں سب چل رہے ہیں۔ تجارتی زندگی کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ شب و روز باہم تصادم و تسابق ہو اور ملکوں میں ایسے موقعہ پر تجارت ہی کے میدان میں پیچ لڑائے جاتے ہیں، مگر یہاں یہ تدبیر اختیار کی گئی ہے کہ تلوار کی جگہ قلم کا وار کر کے پھر باطمینان حریف کی دوکان لوٹ لی جائے۔ یہ قصہ کئی ماہ تک جاری رہا اور اب تک جاری ہے۔ کیکر سنگھ نے غلام پہلوان سے عاجز آ کر اس کی کمی پٹی پر مکہ کی ایک سخت ضرب لگا دی تھی۔ اس طرح یہ قلم دکاغذ کے پہلوان جب عاجز آ جاتے ہیں تو پھر ایک دوسرے کو گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔

ایک اپنے حریف سے پوچھتا ہے کہ وہ زمانہ بھی یاد ہے جب کالج میں پڑھتے تھے؟ دوسرا کہتا ہے کہ زیادہ باتیں نہ بناؤ ورنہ میں تمہارا فلاں راز فاش کر دوں گا۔ اب یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ ایک دوسرے کو چور اور ڈاکو بتلاتے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ تم نے طرابلس کے نام پر روپیہ کھا لیا ہے، دوسرا کہتا ہے کہ فرضی کمپنیاں بنا کر قوم کو لوٹ لیا۔ یہ حالت صرف مسلمانوں ہی کی نہیں ہے بلکہ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔ ہندو اور آریا اخبارات کو کھولئے تو وہ بھی ایک دوسرے کو ذلیل کرنے کے شریفانہ شغل ہی میں خوش ہیں۔

بدبختو! صرف تم ہی ذلیل نہیں ہو۔ بلکہ تمہاری تمام قوم اور پورا ملک ذلیل ہے۔ جس قوم پر خدا کا قہر نازل ہوتا ہے اس کا یہی حال ہوتا ہے پہلے اس سے حکومت چھین کر غیروں کو اس پر مسلط کر دیتا ہے۔ بنی اسرائیل نے جب خدا سے منہ موڑا تو ان پر ایک باہر کی قوم بھیج دی گئی۔

فبعثنا علیکم عباداً لنا اولی باسٍ شدید — پھر ہم نے تم پر ایک سخت شدید قوم کو مسلط کر دیا۔

جب اس پر بھی باز نہیں آتے تو پھر فسق و فجور، حسد و حقد، ہوا پرستی و نفسانیت، نااتفاقی و بیگانگت ہیں ان کو مبتلا کر دیتا ہے۔ خود ہی کٹتے اور خود ہی مر جاتے ہیں۔

وما اھلکنا قریۃ الا واھلھا ظالمون — اور ہم کسی آبادی کو تباہ نہیں کرتے مگر اس وقت جبکہ وہ ظلم و معاصی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

ہم اپنے معاصرین سے بہ منت التجا کرتے ہیں کہ خدا کے لئے اپنی ملت پر نہیں تو خود اپنے اوپر رحم کریں اور مسلمانوں کی موجودہ ذلت و رسوائی پر قناعت کر لیں۔ نفسانیت و خود پرستی کی حد ہو گئی ہے اور خدا کی طرف سے سب نے منہ موڑ لیا ہے۔ تعجب ہے کہ ساری دنیا آپ پر ہنس رہی ہے اور آپ کو ایک لمحہ کے لئے بھی اپنے اوپر رونا نہیں آتا؟

ملک و ملت کی خدمت شاید اس طریقے سے الگ ہو کر بھی کی جا سکتی ہے، یہ تو کچھ ضروری نہیں کہ جب تک آپ ایک دوسرے کو چور ثابت نہ کر لیں۔ اس وقت تک آپ کی زیر اصلاح قوم آپ کو اپنا امین نہ سمجھے گی۔

تو بخویشتن چہ کردی کہ بما کنی نظیری
بخدا کہ واجب آمد ز تو احتراز کردن

تمام شد

نسیم حجازی کا معرکۃ الآرا اسلامی تاریخی ناول

آخری چٹان

- بغداد کی تباہی کی ایک عبرتناک داستان
- چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کی خونریزی اور ظلم و تشدد کی دردانگیز کہانی
- جب ایران ایشیائے کوچک اور عرب میں تاتاریوں نے تباہی مچا رکھی تھی
- جب کہ شہر خوارزم کا بچہ بچہ ان کی خونیں تلواروں کی بھینٹ چڑھ گیا
- جب بغداد میں لوگ اپنی آزادی برقرار رکھنے کی بجائے شیعہ سنی کے جھگڑوں میں گرفتار تھے
- جب خاندان عباسیہ کے آخری خلیفہ نے شراب کے نشہ میں مدہوش ہو کر اپنی

تمام عقل ایک غدار وزیر کے سپرد کر دی۔ اس وقت سرزمین بغداد سے ایک مجاہد اٹھا۔ اس نے سوئے ہوئے شیروں کو جگانا چاہا۔ بغداد کی ایک نازک اندام دوشیزہ نے تلوار اٹھائی اور مسلمانوں کو ہوشیار کرنے کے جرم میں شہید کر دی گئی۔ نمک حراموں اور غداروں نے مسلمانوں کو باہمی جھگڑوں کا نشہ پلا کر اس طرح سلا دیا کہ وہ جھنجھوڑنے کے باوجود نہ جاگے۔ اور آخرکار بغداد تباہ ہو گیا — **آخری چٹان** نسیم حجازی کا یہ اسلامی شاہکار بغداد کی تباہی کا ایک خونیں مرقع ہے جس کو پڑھ کر دل دہل جاتا ہیں۔ قیمت چھ روپے۔